جلد ۱۰۶ ستمبر ۱۹۸۶ء عدد ۱

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

استفسارات

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

ترتیب و تدوین: اختر حجازی

- مولانا مرحوم فہم دین کے فن کے شناور تھے ان کی مجلس سے کوئی تشنہ نہ اٹھتا تھا۔
- مولانا مرحوم سینکڑوں مجالس میں ہزاروں سوالات کے جوابات دیتے اور کوئی محروم نہ رہتا تھا۔
- مولانا کے ہزاروں معتقدین تھے جو طلب دین کیلئے ان سے رجوع کرتے تھے اور کوئی مایوس نہ لوٹتا تھا۔
- یہ خصوصیت مولانا مودودیؒ کو خداداد صلاحیت کے طور پر حاصل تھی۔
- لوگوں نے ہزاروں سوالات کیے مولانا مودودیؒ نے ہزاروں جوابات دیے

مولانا اختر حجازی صاحب کی محنت و جستجو ہے کہ انھوں نے ان سوالات کو مع جوابات حاصل کر کے ایک ایسا مجموعہ مرتب کر دیا جو تشنگان علم کیلئے سرچشمہ حیات کی حیثیت رکھتا ہے

- ایک کتاب سے عالم کتاب بن جانے کا نسخہ حاضر خدمت ہے۔

سائز: ۲۳×۱۸/۸ • صفحات: ۴۴۸ • قیمت: ۴۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار ○ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۶ | ستمبر ۱۹۸۶ء مطابق محرم الحرام ۱۴۰۷ھ | عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اب سامنے ہے ماہِ جہاد!

حج جیسی عظیم عبادت کا مہینہ تو وحی سے مقرر کیا گیا اور وحی کے تحت ہی قرآن و حدیث میں اس کے پانچ دنوں کے لیے آداب، شعائر اور مناسک متعین کر دیے گئے۔

اب حج جیسی عظیم عبادت سے گزر کر ہم مسلمانانِ عالم ایک ایسے مہینے میں داخل ہونے والے ہیں جس کے لیے بروئے وحی تو کوئی خاص مقاصد و احکام متعین نہیں ہیں کہ اس مہینے کی یا اس کے ایامِ عاشورہ کی یہ حیثیت ہے اور اس کے لیے یہ اور یہ آداب و شعائر ہیں۔ ایامِ عاشورہ کے نفل روزے البتہ واقعہ کربلا سے پہلے سے رائج چلے آ رہے تھے۔ اس مہینہ کو اہمیت انسانی تاریخ کے ایک بڑے واقعہ اور انسانی کردار کے اعلیٰ اور اسفل دو نمونوں کے تقابل سے ملی ہے۔

کتنے ہی اصحاب کے نزدیک یہ ماہِ ماتم ہے، مگر میں سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ماہِ جہاد ہے۔ حج کی عبادت جس کے مراحل بہ حیثیت مجموعی جہاد آموز ہیں، اس کے فوراً بعد ہماری تاریخ کا ہمارے سامنے اسلاف میں سے ایک روشن ستارے اور اس کے رفقا کے انقلابی کردار کو نمایاں کر دینا اور اس کے بالمقابل تاریکیِ فکر و عمل کے ایک پیکرِ شہنشاہیت کے ساتھ تشدد کیش دربار یوں اور فوج کی جبریت کا منظر دکھانا ایک ایسے نقطۂ فکر و احساس پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں ایک طرف دنیا اور اس کی لذتیں ہیں جن کے حصول کے لیے صرف اپنے دل کی روشنی کو گل کرنا، اپنے ضمیر کو پتھر بنانا اور اپنے چہرے پر ذلت کی کیچڑ کا لیپ کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ایمان ہے اور اخلاق کی بلندیاں ہیں، کردار کی تابانیاں ہیں، جذبۂ جہاد کی سرشاریاں اور ایثار و فدائیت کی سرمستیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے، جس کا ایک مظہر جنت کی دائمی زندگی بھی ہے، مگر اس طرف جانا ہو تو اپنے ہی لہو کی [illegible] میں ڈوب کر جانا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے یہ دو ہی اُصولی راستے بتائے ہیں: ایک دنیا پرستی اور جبر کیشی کا راستہ، دوسرا خدا پرستی، دعوتِ حق، جہاد، صبر اور عزیمت کا راستہ۔ وہ انسانی پستی کا اظہار ہے اور یہ انسانی عظمت و سربلندی کا۔

اوّل الذکر راستے پر چلنے والے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی بے جان متحرک لاشوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مؤخر الذکر راستے کے راہی مرنے کے بعد بھی زندہ تر ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا مقصد اور پیغام تاریخ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ مقامِ ماتم کدھر ہے اور مقامِ فخر کدھر؟ ہار کس کی ہے اور جیت کس کی؟

امام حسینؓ نے تو ایک درسِ جہاد ہمارے لیے کربلا کی ریت کے ذرّوں پر اپنے خون سے لکھا تھا، آج ضرورت اس درس کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے۔

یہ بیان کہ وہ مکہ سے نکلے تو وہ جہاد کے ارادے سے نہیں نکلے تھے اگر جہاد کے لیے نکلتے تو اور رضا ساتھیوں کو ساتھ لیتے، اُلٹا جو ساتھ چلے تھے، ان کو بھی واپس چلے جانے کی تلقین تا دمِ آخر کرتے رہے۔ نیز امام کی طرف سے تین شرطیں پیش کی گئیں جن کو نامنظور کر کے دشمن قوت نے جنگی صورتِ حال اور انتہائی بہیمیت کی فضا پیدا کر دی۔ اس میں اگر جہاد کے معانی کو قتال کے معنی سے وسیع تر کر دیا جائے تو امام حسینؓ کا ملوکیت کی راہ پر چلنے والی یزیدی حکومت کے خلاف انکارِ بیعت کرنے سے لے کر، اس کی معاشرت و ثقافت پر تنقید کرنے تک، اور ترکِ قیامِ مکہ سے قربانی کربلا تک، امام کی ساری کی ساری سرگرمیاں جہاد کی تھیں۔

امام کے سامنے حکومتِ اسلامی کے جمہوری طریقِ خلافت کو بدل دیا گیا تھا، مسلمانوں کے بیت المال کو دھڑلے سے لُٹایا جا رہا تھا، رقص و سرود کی سرگرمیوں میں دربار کی خصوصی سرپرستی سے اضافہ ہو رہا تھا، امارت اور عہدوں کے لیے معیارِ تقویٰ کی قرآنی شرط ٹوٹ چکی تھی، عوام کی دینداری کے باوجود طبقۂ خواص نے لادینیت کے لیے راستے کھول دیے تھے، قانونِ شریعت کو مقامِ اوّل سے اُٹھا کر کہیں ساتویں درجے میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ خوفناک تبدیلی جس کا نام یزید کے نام پر سر دَور میں یزیدیت ہونا چاہیے اس کے خلاف امام حسینؓ کی مجاہدانہ دعوت و تحریک کا منشا یہ تھا کہ حکمران طاقت میں تبدیلی نہ بھی آئے تو کم از کم عام مسلمانوں اور ان کے سربراہوں کے جذبوں میں ایک نیا اُبھار پیدا ہو۔

واقعہ ایسا تھا جیسے تاریخ کی جھیل میں بہت بڑی چٹان پھینک ماری جائے۔
ایسا نہ تھا کہ ہزاروں صحابہ کرامؓ اور عوام کے دیگر نیک نہاد نیش رؤوں کی توجہ اس مسئلہ پر نہ تھی۔ مگر جس سختی سے عوام کو جبر و تشدد سے خوف زدہ کیا گیا تھا اور اشرفیوں کی چھنا چھن سے جو جادو طاری کر دیا گیا تھا، زعما اس کی گرفت سے عوام کو نکالنے کے راستے سوچتے تھے اور سناٹا کہہ رہا تھا کہ آگے یا پیچھے کسی نہ کسی ہستی اور گروہ کے ذریعے کوئی تحریک اٹھنے والی ہے۔ امام حسینؓ کا شرف یہ ہے کہ وہ پہل کر گئے اور "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" والی بات ہو گئی۔
لوگوں نے کربلا کو فرقہ وارانہ جھگڑوں یا فی سبیل اللہ فساد کا موضوع بنا لیا، حالانکہ وہ فی سبیل اللہ جہاد کا ایک سبق تھا!

(۲)

اس مضمون کے آغاز میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ مجھے حکمران گروہ سے یہ امید بے جا ہے کہ وہ اسلام کے تقاضوں کو ایسی مؤثر شکلوں میں لانے پر تیار ہو سکتا ہے کہ اسلامی حدود و اقدار کا عملاً احیا ہو، نہ اپوزیشن کے کسی گروہ کے متعلق ایسے کسی مغالطے میں میرا دل مبتلا ہے کہ لہٰذا میں جو گفتگو کر رہا ہوں اس سے کسی کا یہ نتیجہ نکالنا ایک زیادتی ہو گا کہ میں اول الذکر کا ساتھی ہوں یا مؤخر الذکر کا مخالف۔ میرے سامنے معاملہ کسی ایک جماعت اور دوسری جماعت کا نہیں ہے بلکہ میں دو طرفہ متخالف طاقتوں کے باہمی تعامل و تصادم سے پیدا ہونے والے حالات پر گفتگو کر رہا ہوں۔

یہودیوں کے پروٹوکول میں جمہوریت کو مخالفین (غیر یہودی لوگ یا گوئم) کے لیے ذریعہ تخریب و انتشار بنانے کا جو پروگرام میں نے کبھی پڑھا تھا اس کے باوجود مجھے یہ توقعات رہیں کہ ہم مسلمان اگر خدا پرستی، اخلاق اور مساوات کے گراں قدر اصولوں کے فریم میں جمہوری سسٹم کی نئی تشکیل کر کے چلیں تو یہودیوں والی اسکیم اور بعض مغربی فلسفیانِ سیاسیات کے اندیشوں، نیز بڑے بڑے فتنہ آفرین سامراجی ممالک کے ہمت شکن تجربات کے گھیرے سے ہم نکل سکتے ہیں۔ یہ امید اس وقت فزوں تر ہو گئی۔ جب ملک کے نمائندہ جید ۳۳ علماء نے مختلف مکاتب فکر سے

متعلق ہونے کے باوجود ۲۲ دستوری نکات کی بنیاد پر جمہوریت کا ایک خوبصورت خاکہ پیش کیا۔ سچ یہ ہے کہ ہزار خرابیٔ احوال کے باوجود اپنے پاکیزہ تصورِ جمہوریت کی کامیابی کا یقین میرے اندر کبھی ٹوٹا نہیں۔ اور نہ میں نے بعض دوسرے اصحاب کی طرح ترکِ جمہوریت اور غیر جمہوری شورائی نظام کے تصورات کی رو میں کبھی غوطے کھائے۔

البتہ میری جمہوری خوش خیالیوں پر پہلی زد اس وقت پڑی جب صدر ایوب صاحب کے دور کے آخر میں کشتیٔ ڈانواں ڈول ہونے لگی اور مارشل لا کا بادبان ناکارہ ہو گیا۔ اُس وقت جمہوریت کو سیاسی لیڈروں کی ایک قومی کونسل کی شکل میں ایوانِ صدر میں طلب کیا گیا۔ یہ بہترین موقع تھا کہ جمہوریت آگے بڑھتی، اقتدار پر قابض ہوتی اور جبریت اور تحزب و انتشار کی فضا کا خاتمہ کر دیتی۔ مگر اس موقع پر ایک صورتِ واقعہ ایسی پیش آئی کہ جمہوریت کی رُوح پہلی سانس لیتے ہی پرواز کر گئی۔

مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ تمام کے تمام لیڈروں کو جمع کیا جانا چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ ملک کی وحدت و سالمیت یا اسلامی اقدار کے متعلق ان کا نظریہ و عمل کچھ بھی ہو۔ جمہوریت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ "سب کے سب"! اِس طرح ایک بڑا مجبورانہ مقام سامنے آیا اور جمہوریت کے لیے تباہ کن ایسے ہی مجبورانہ مقام ہوتے ہیں۔ ہماری موجودہ جمہوریت جب ایک بار "سب کے سب" کا اُصول اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کا کوئی نظریہ نہیں رہتا۔ اور اس کا کوئی اخلاقی معیار نہیں رہتا۔ وہ اگر غلط الفکر اور تخریب کار عناصر بلکہ چوروں اور ڈاکوؤں یا اُن کے سرپرستوں کو ساتھ لے کے نہ چلے تو سرے سے کام چلتا ہی نہیں۔ اور ان کو ساتھ لے کے چلے تو پھر کوئی اُصول اور مقصد سلامت نہیں رہتا۔ شیخ مجیب کا معاملہ عجیب پیچیدگی لے کے آیا۔ ایک طرف اس کا رویہ وہ تھا جس سے بنگلہ دیش کے تصور کی آبیاری ہو رہی تھی اور ساتھ ہی وہ اگرتلہ سازش کیس کے تحت عدالت میں پیش تھا۔ مگر مصلحتی سیاست نے کہا کہ اسے پیرول پر رہا کر کے یہاں لایا جانا چاہیے۔ اور لایا گیا۔ لیکن عملاً واقعات نے یہ شکل اختیار کی کہ کارروائی کی سماعت کرنے والی ہستی ایس اے رحمن مرحوم کو تو سب نے چھوڑ کر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا۔ اور جس مجرم کا معاملہ زیرِ سماعت تھا وہ صدر ایوب

کے پہلو میں بیٹھا مرکز توجہ بنا ہوا تھا۔ صدر ایوب اُس وقت بے دم ہو چکے تھے، پورے جمہوریت نواز لیڈروں میں سے کوئی نہ تھا جو مجیب سے پوچھ سکتا کہ جناب کیا کیا کہتے اور کرتے پھر رہے ہیں، ذرا اپنی پوزیشن سیاسی پنچایت کے سامنے واضح تو کیجیے۔ بخلاف اس کے دولتانہ صاحب کی امامت میں سب کے سب خوشامد میں لگے تھے۔ جس نظام میں مجرم (اور حقیقی مجرم) قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھے اور اسے خود قوم کے سیاسی اکابر نیازمندی سے بلا کے زینتِ محفل بنائیں اور جس کا جج جوتیاں چھوڑ کر، ایک بنیان میں جان بچانے کے لیے قیام گاہ سے نکل بھاگے اس کے اگر تمام ذہین لیڈر دس سال تک بھی اپنی ناک رگڑتے رہیں تو اس میں سچی جمہوریت نہیں آسکتی۔

اِس محفل آرائی فاقدین کا نتیجہ کیا نکلا، ایک اور فوجی آمر (جس کے مقابلے میں صدر ایوب دس گنا زیادہ شریف تھا) نے مارشل لا کے پچکے ہوئے غبارے میں پھر پھونک بھری۔ اس نئے آمر کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے مارشل لا کی چھتری کے نیچے ایسے طریقے سے انتخابات کرائے کہ بھٹو صاحب اور اُن کی پارٹی برسرِ اقتدار آگئی اور اس نئی قوت نے "دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب" کا وہ سماں پیدا کیا کہ جمہوریت کُشی کا حق ادا ہو گیا۔ نعرہ پھر بھی یہ رہا کہ "جمہوریت ہماری سیاست ہے"۔

اسی سلسلۂ احوال کا تکمیلی عمل وہ تھا کہ قومی اسمبلی کا ایک اجلاس سابق مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں منعقد ہونا تجویز ہوا اور اس پر بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ جو شخص مغربی پاکستان سے اُس اسمبلی میں شرکت کے لیے جائے گا ہم اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ کیا جمہوریت میں ٹانگیں توڑنے کی بھی گنجائش ہے؟ چونکہ یہ گنجائش نہیں تھی اس لیے ملک کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ کتنا مایوس کُن تجربہ تھا!

بیچ کا دور چھوڑ کر میں تازہ صورتِ حالات کو لیتا ہوں۔ ووٹوں کے زور سے جس کا جی چاہے، حکومت پر قابض ہو اور جس کا جی چاہے اپوزیشن کا کردار ادا کرے، مگر کسی کو حق نہیں کہ گالی سے لے کر گولی تک استبداد کی کسی بھی غیر انسانی صورت کو سیاست میں داخل کرے۔

مگر یہ ستم بھی ہوا۔

مجھے اگر اجازت ہو تو میں صاف صاف کہوں کہ جس طرح کے انتخابات اور جس طرح کے جوڑ توڑ سے حکومت اور اس کے ادارے بنتے ہیں۔ ان حالات میں جمہوریت لازماً کمزور ہوتی ہے۔ لیکن اس کے جواب میں جو طوفانی اپوزیشن اُٹھی اُس نے پہلے دور میں مصنوعی ہجوموں کے ذریعے پوری قوم کو بھی اور اُس کی حکومت کو بھی دھمکانا چاہا کہ ہم ایسی عوامی طاقت لے کے آرہے ہیں جو تخت اُلٹ دے گی۔ اس کے ساتھ نہایت کثرت سے بدترین گالیاں جمہوریت کے دامن میں ڈالیں، عوام کے مذاق کو خراب کیا اور اخلاق کی سطح کو گرایا۔ پھر صاف صاف دھمکیاں دیں کہ ہم چاہیں تو گورنمنٹ ہاؤس اور تمام دوسرے اداروں کو جلا کے راکھ کر دیں۔ اپوزیشن کی جمہوریت مسلح دستے لے کے سامنے نکلی۔ دوسرے دور میں مُلکی قوانین اور امن عامہ پر اپنی سابق دھمکیوں کے مطابق عمل کیا اور پھر جب حکومت نے روک تھام کرنا چاہی تو اُسے مجرم قرار دیا۔

اِس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آئندہ بھی جو کوئی حکومت پر قابض ہو تو اُسے مجرم سمجھ کر بات کی جائے اور جو کوئی اپوزیشن میں ہو وہ اگر عوام کی جان و مال کی تباہی کا باعث بھی بنے تو اُسے خادمِ قوم قرار دیا جائے۔

کیا اِس قسم کی سیاسی ذہنیت اور اس قسم کے طریقوں کے سامنے کبھی بھی سچی جمہوریت اور اس کے پہلو بہ پہلو امن اور شرافت ظہور کر سکتے ہیں، بعض بنیادی تبدیلیاں کیے بغیر یہ ہرگز ممکن نہیں۔

اسلام کے اُصولوں کے مطابق ایک اچھے نظامِ جمہوریت کی تشکیل کے لیے جن بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے وہ ہم شرح سے پہلے اپنے لٹریچر میں واضح کہہ چکے ہیں اور ان کو موقع بہ موقع پھر واضح کریں گے۔

لیکن یہاں چند ایسی اصلاحات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُوپر اُوپر کی سطح پر ہو جانی چاہئیں۔

ایک یہ کہ حکومت کے عمائد اور اپوزیشن کے سیاسی لیڈروں کے اتفاق رائے سے ایک ضابطۂ اخلاق بننا چاہیے، جس میں مختلف ضروری باتوں کے ساتھ یہ بھی طے کیا جائے کہ کوئی شخص یا گروہ کسی شخص یا گروہ کو گالی نہیں دے گا، کوئی کسی کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کی دھمکی نہیں دے گا۔ کسی کو حق نہ ہوگا کہ وہ قومی اور حکومتی املاک کی تباہی میں حصہ لے۔ ہر ایک اپنے اپنے پروگرام یا اپنے اجتماعی حسنِ اخلاق اور حسنِ خدمات کی طرف عوام کو دعوت دے گا۔ یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ ایک ہی شہر میں، ایک ہی تاریخ میں مختلف جماعتوں کے جلسے، جلوس اور مظاہرے بالعموم نہیں ہونے چاہئیں اور کوئی لازمی ضرورت پیش آجائے تو اوقات اور راستوں (ROOTS) کا اس طرح تعین کیا جائے کہ اشتعال اور ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو، بلکہ اُلٹا سمجھوتہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کے افراد کو مدد دی جائے اور آرام پہنچایا جائے گا اور رہنمائی کی ضرورت ہو تو رہنمائی دی جائے گی۔

اسی طرح اخبارات اور سرکاری ذرائع ابلاغ کے کارپردازوں کو اپنے ضابطۂ اخلاق میں یہ طے کرنا چاہیے کہ ایک تو حقیقی خبروں کو چھپایا نہ جائے، دوسرے ہنگاموں یا فسادوں کی خبریں، تصویریں اور سرخیاں اس طرح نہ دی جائیں کہ کسی فریق کے خلاف کسی دوسرے فریق میں ردِعمل اُبھرے۔ ذرائع ابلاغ کی پالیسی یہ بھی ہونی چاہیے کہ جس طرح حکومت کی طرف سے جبر ہونے پر اُس کے خلاف نوٹ لکھے جاتے ہیں، اپوزیشن کی طرف سے گندی زبان استعمال ہونے پر، دھمکیاں دینے پر، اشتعال انگیزی اور تصادم انگیزی کرنے پر مسلح دستوں کو ساتھ لے کر سیاسی جلسوں اور مظاہروں کا انتظام کرنے اور پھر پبلک کے سامنے اسلحے کا مظاہرہ کرنے پر سخت تنقیدی نوٹ لکھے جائیں۔

تیسرا سمجھوتہ وزارتی و پارلیمانی اکابر، سیاسی لیڈروں اور اخباری حضرات اور سرکاری ذرائع و ابلاغ کے کارپردازوں میں یہ ہونا چاہیے کہ اسلامی عقائد و شعائر، اس کے سیاسی و معاشی نظام، اس کے نظامِ تعلیم و اخلاق یا قانونِ حدود و تعزیرات یا ضابطۂ حجاب پر حملے نہ کیے جائیں، اسی طرح پاکستان، سالمیت پاکستان اور نظریہ پاکستان کو مجروح نہ کیا جائے۔ ان مباحث کے متعلق نہ ادارتی کالم استعمال کیے جائیں، نہ دوسروں کے مضامین و مقالات

اور انٹرویوز شائع کیے جائیں۔ بلکہ اسلام کے متعلق انتشار انگیز، اور اسلام کے علمائے سلف کے متعلق توہین آمیز اور علمائے حاضر کے متعلق پُرتضحیک اندازِ بیان پر بھی سخت گرفت کی جائے۔ اسی طرح نظریہ پاکستان، پاکستان، وحدت و سالمیتِ پاکستان اور استحکامِ پاکستان کے خلاف اگر کسی جانب سے ناوک اندازی ہو رہی ہو تو ہمارے اسٹیج اور پریس اور نشری اداروں کو بغلیں نہیں بجانی چاہئیں، بلکہ ایسی مثالوں کے خلاف نفرت و بیزاری کا اظہار کرنا چاہیے۔

یہ چند اصلاحات وقتی ضرورت کی ہیں یا یوں سمجھیے کہ فسٹ ایڈ کی نوعیت رکھتی ہیں کسی دوسرے موقع پر یہ واضح کیا جائے گا کہ اس جمہوریت میں کن بنیادی تغیرات کی ضرورت ہے جن کے بعد جمہوری نظام اسلام کے بارِ امانت کو اٹھا سکتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ موجودہ فتنہ انگیز جمہوریت جو ایک جبریت سے نکال کر ہمیں دوسری فسطائیت تک لے جاتی ہے، آخر اس کے ساتھ ہم کیوں چل رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم جس طرح موجودہ بگڑے ہوئے معاشرے کے ساتھ چل رہے ہیں اور ہمارا منشا جس طرح کسانوں اور دکانداروں اور استادوں اور طلبہ میں دعوتی کام کرنے کا ہے، اسی طرح جمہوریت میں بھی ووٹروں کے اندر اور پارلیمانی محفل کے اندر بھی دعوت کا کام کرنے کا کام ہے —— اور ہم اسلام کے دائرۂ اثر کو بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ہماری نگاہیں اگر اس امر پر مرتکز نہ رہیں اور ہم بھی بے اصول گروہوں کے مصلحتی جوڑ توڑ کے روزمرہ کے چکروں میں نت نئی اسکیمیں سوچنے اور نت نئی بولیاں بولنے پر اتر آئیں تو موجودہ بیمار جمہوریت ہمیں بھی بیمار کر سکتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں بیمار نہ بنائے، چارہ گر بنائے۔

امام بخاریؒ اور اُن کی علمی خدمات

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

(۲)

تصانیف پر مختصر تبصرہ

۱۔ الادب المفرد:۔ یہ کتاب حدیث سے متعلق ہے۔ اس میں اخلاق و آداب سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان صحیح معنوں میں انسان بن جاتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی رئیس بھوپال م ۱۳۰۷ھ نے اس کا اُردو ترجمہ بنام توفیق الباری للادب المفرد للبخاری کے نام سے کیا۔ آج کل یہ کتاب ہفت روزہ الاعتصام لاہور میں حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر الاعتصام کے حاشیہ و تعلیق و تبویب سے شائع ہو رہی ہے پہلے پہل یہ کتاب آگرہ سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔

۲۔ التاریخ الکبیر:۔ یہ کتاب امام بخاریؒ نے ۱۸ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں روضہ مبارک اور منبر نبوی کے درمیان بیٹھ کر لکھی تھی۔ اس کتاب میں امام صاحب نے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، میں سے رواۃ حدیث کا استیعاب کیا ہے اور ناموں کے لکھنے میں حروف تہجی کی ترکیب رکھی ہے۔ جیسا کہ امام صاحب فرماتے ہیں:

لا اجئی بحدیث عن الصحابة والتابعین الا عرفت مولد اکثرھم ووفاتھم ومساکنھم

یعنی میں نے صحابہ و تابعین سے جو احادیث بھی بیان کی ہیں۔ میں اُن میں سے

ہیں اُن میں سے اکثر کے راویوں کے مسلک و مولد اور سالِ وفات سے واقف ہوں۔

اور آگے چل کر امام صاحب مزید فرماتے ہیں:

لا یوجد اسم فی التاریخ الاولہ عندی قصۃ الا انی کرھت ان یطول الکتاب۔

یعنی تاریخ میں بمشکل ہی کوئی نام ایسا ہے جن کے حالات مجھے مفصل طور پر معلوم نہ ہوں، لیکن طوالت کے خوف سے میں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔[1]

یہ کتاب دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن سے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔

۳۔ التاریخ الاوسط:۔ اس کتاب کے متعلق تفصیل نہیں مل سکی۔ اس کا قلمی نسخہ دوسری جنگِ عظیم تک جرمنی کے سرکاری کتب خانہ برلن میں موجود تھا۔[2]

۴۔ التاریخ الصغیر:۔ فنِ تاریخ میں امام صاحب کی یہ ایک نادر کتاب ہے۔ اس میں امام صاحب نے مشاہیر صحابہ، تابعین و تبع تابعین کے نسب اور تاریخہائے وفات کا ذکر کیا ہے، ساتھ ساتھ جرح و تعدیل بھی کی ہے۔ اس کی تالیف تاریخہائے وفات کے مطابق کی ہے۔ جیسا کہ خطبہ میں فرماتے ہیں۔

کتاب مختصر من تاریخ النبی صلی اللہ علیہ وسلم والمہاجرین والانصار وطبقات التابعین لهم باحسان ومن بعدهم ووفاتهم وبعض نسبهم وکناهم ومن یرغب من حدیث۔

یعنی یہ ایک مختصر تاریخ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین و انصار و طبقات تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کے بارے میں اس کتاب میں ان کی وفات، ان کے نسب، اُن کی کنیت وغیرہ، نیز جن حضرات سے حدیث اخذ کرنے میں اعراض کیا گیا، ان کا ذکر بھی کیا گیا۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری لابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)

[2] سیرۃ البخاری ص ۱۶۷

یہ گراں قدر کتاب الہ آباد سے شائع ہو چکی ہے ۔

۵ ۔ خلق افعال العباد :۔ صحابہ و تابعین جس طرح آیات و احادیث سے فرق باطلہ کا رد کرتے ہیں ۔ وہی طرز اس کتاب کا بھی ہے ۔ اس کتاب میں فرقہ باطلہ جہمیہ اور معطلہ کا رد ہے اور آیات و احادیث کے ساتھ آثار صحابہ و اقوالِ تابعین بھی درج ہیں ۔ یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے ۔

۶ ۔ جزء رفع الیدین : رفع الیدین کے بارے میں بڑی جامع کتاب ہے ۔ اثبات رفع الیدین کے علاوہ روایات عدم رفع الیدین پر بھی بخوبی تنقید کی ہے ۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے ۔ یہ کتاب بھی مع اُردو ترجمہ شائع ہو چکی ہے ۔

۷ ۔ جزء قراءۃ خلف الامام :۔ امام صاحب کا مشہور رسالہ ہے ۔ امام صاحب نے اس رسالہ میں قراءۃ خلف الامام کو بدلائل احادیث و آثار ثابت کیا ہے ۔ اور اس سلسلے میں کیے جانے والے اعتراضات کے جواب نہایت عمدگی سے دیئے ہیں ۔ جن سے امام صاحب کے فنِ مناظرہ میں ید طولیٰ اور مہارتِ تامہ رکھنے کا ثبوت ملتا ہے ۔ یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے ۔ اور اس کا اُردو ترجمہ بھی[1]

۸ ۔ برّ الوالدین :۔ اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے ، لیکن اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی ۔

۹ ۔ کتاب الضعفاء الصغیر :۔ اس کتاب میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے ضعیف راویوں کے نام گنوائے گئے ہیں ۔ اکثر صورتوں میں وجۂ تضعیف اور راوی کے تلمذ کا بھی ذکر کیا ہے ۔ تصنیف میں جو غیر معمولی احتیاط برتی گئی ہے ۔ اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے ۔

---

[1] اس مسئلہ میں بڑی بڑی کتابیں تالیف ہو چکی ہیں ۔ امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) کی کتاب القراءۃ ۔ علامہ عبدالحی لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) کی امام الکلام (عربی) مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (م ۱۳۵۳ھ) کی تحقیق الکلام اور مولانا حافظ محمد گوندلوی (م ۱۴۰۵ھ) کی خیر الکلام بڑی جامع تالیفات اور قابلِ مطالعہ ہیں ۔

یہ کتاب بھی مطبوعہ ہے۔

۱۰۔ الجامع الکبیر:۔ اس کتاب کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ اس کا کامل علمی نسخہ حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دار العلوم برلن (جرمنی) میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے موجود تھا۔ اب معلوم نہیں کہ یہ نسخہ موجود ہے یا ضائع ہو چکا ہے[1]

۱۱۔۔۱۲۔ المسند الکبیر، التفسیر الکبیر:۔ ان دونوں کتابوں کا ذکر امام صاحب کے تلمیذ امام محمد بن یوسف فربری (م ۳۲۰ھ) نے کیا ہے۔ ان کتابوں کی تفصیل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا[2]

۱۳۔ کتاب الاشربہ:۔ اس کتاب کا ذکر امام دار قطنی (م ۳۸۵ھ) نے اپنی کتاب المؤتلف والمختلف میں کیا ہے۔

۱۴۔ کتاب الھبہ:۔ اس کا ذکر امام بخاری کے کاتب ابوجعفر محمد بن ابی حاتم وراق (کاتب بخاری) نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں!

وعمل کتابا فی الھبۃ فیہ نحو خمس مائۃ حدیث وقال لیس فی کتاب وکیع فی الھبۃ الاحدیثان مسندان او ثلثۃ وفی کتاب ابن مبارک خمسۃ او نحوھا۔

یعنی انہوں نے ہبہ کے موضوع پر پانچ سو کے قریب احادیث پر مشتمل ایک جامع کتاب لکھی ہے۔ جبکہ اس موضوع پر وکیع کی کتاب میں صرف دو یا تین احادیث ہیں اور مبارک کی کتاب میں صرف پانچ کے لگ بھگ۔

اس کتاب کے بارے میں بھی تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔

۱۵۔ کتاب المبسوط:۔ اس کتاب میں احادیث سے فقہی مسائل مستنبط کر کے تفصیل سے

---

[1] سیرۃ البخاری ص ۱۶۸۔

[2] المسند الکبیر کا قلمی نسخہ امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دار العلوم برلن (جرمنی) میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے موجود تھا (سیرۃ البخاری ص ۱۷۰)

بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوسکی ہے، اور نہ ہی اس کی کوئی تفصیل معلوم ہوسکی ہے، اس کا قلمی نسخہ حافظ ابن مندہ (م ۳۰۱ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا دوسری جنگ عظیم سے قبل جرمنی کے کتب خانہ میں موجود تھا [1]

۱۶۔ کتاب الکنیٰ:۔ روایت حدیث میں کنیتوں کا استعمال ضروری ہوتا ہے تاکہ ایک راوی کا اختلاط دوسرے راوی سے نہ ہو۔ اس کتاب میں امام صاحب نے اُن رجال کا تذکرہ کیا ہے، جو اپنی کنیت سے مشہور و معروف ہوئے۔

۱۷۔ کتاب العلل:۔ محدثین کرام کی اصطلاح میں علتِ حدیث سے مراد وہ مخفی اور پوشیدہ وجوہات اور اسباب ہیں جو حدیث کی صحت اور قبولیت میں قادح ہوتے ہیں۔ حالانکہ حدیث بظاہر ہر طرح سے صحیح اور سالم نظر آتی ہے۔ یہ علم علومِ حدیث میں نہایت دقیق اور مشکل سمجھا گیا ہے، اس کے لیے راویوں کی تاریخ ہائے پیدائش، لقاء رواۃ اور تاریخ ہائے وفات پر عبور حاصل کرنے کے علاوہ ہر راوی کے الفاظ حدیث اور حدیثوں کا احاطہ بھی ضروری ہے۔ محدثین کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ علم نہایت غامض اور ادق ہے، لہٰذا اس فن پر کچھ لکھنے کی قدرت انہیں محدثین کو حاصل ہوئی جن کو اللہ تعالیٰ نے فہم و فراست کی روشنی عطا کر رکھی تھی، جن کو قوتِ حافظہ میں ۔۔۔ ۔۔۔ کمال حاصل تھا۔ جن کو حدیث پر مکمل عبور تھا۔ چنانچہ اس فن میں امام علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ)، امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، امام بخاری (م ۲۵۶ھ) اور امام ابوزرعہ (م ۲۸۱ھ) مہارت تامہ رکھتے تھے۔

امام بخاری نے اس کتاب میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس موضوع پر ان سے پہلے کسی اور عالم نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوسکا ہے۔

۱۸۔ کتاب الفوائد:۔ اس کتاب کا ذکر امام ابوعیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ) جنہیں آپ کا شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ جامع ترمذی کی کتاب المناقب میں کیا ہے۔ اس کتاب میں فن حدیث

[1] سیرۃ البخاری ص ۱۷۰۔

کے ایسے نکات بیان کیے گئے ہیں جو فنِ علل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس کتاب کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں مل سکی۔

۱۹۔ کتاب المناقب: اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس میں صحابہ کرام، تابعین و تبع تابعین کے حالات و مناقب بیان کیے گئے ہیں ۔ مگر اس کتاب کی تفصیل بھی نہیں مل سکی ہے

۲۰۔ اسامی الصحابہ: اس کتاب کا موضوع بھی نام سے ظاہر ہے ۔ اس میں صحابہ کرام کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں ۔ اس موضوع پر امام بخاری سے پہلے کسی نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی تھی [۱]

۲۱۔ کتاب الوحدان :۔ اس کتاب میں امام بخاری نے ان رواۃ صحابیوں کا ذکر کیا ہے، جن سے صرف ایک ہی حدیث مروی ہے ۔ امام صاحب سے پہلے اس موضوع پر کسی نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی تھی ۔ البتہ آپ کے بعد آپ کے دو شاگردوں امام مسلم صاحب صحیح مسلم (م ۲۶۱ھ) اور امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی صاحب السنن (م ۳۰۳ھ) نے کتاب الوحدان کے نام سے کتابیں لکھی تھیں ۔ یہ دونوں کتابیں آگرہ میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں ۔ امام بخاری کی کتاب الوحدان کے شائع ہونے کی تفصیل نہیں مل سکی [۲]

۲۲۔ قضایا الصحابہ والتابعین :۔ امام صاحب نے یہ کتاب ۲۱۲ھ میں تصنیف کی تھی ۔ اس کا موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ اس میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کے قضایا فیصلے جمع کیے گئے لیکن افسوس کہ اس کتاب کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا ۔

۲۳۔ کتاب الرقاق ۔ اس کا ذکر صاحب کشف الظنون نے کیا ہے ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں

---

[۱] البتہ اس کے بعد حافظ ابن عبدالبر اندلسی القرطبی المالکی (م ۴۶۳ھ) نے استیعاب، علامہ عز الدین ابن الاثیر الجزری (م ۶۳۰ھ) نے اسد الغابہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) الاصابۃ فی تمیز الصحابہ کے نام سے کتابیں لکھیں ۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مفصل حالات درج ہیں ۔ (عراقی)

[۲] سیرۃ البخاری ص ۱۷۰

کتاب الرقاق للبخاری من کتب الحدیث[1]

اس کی تفصیل بھی معلوم نہیں ہو سکی۔

۲۴۔ الجامع الصغیر فی الحدیث :۔ صاحب کشف الظنون نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل جرمنی کے کتب خانہ میں موجود تھا[2]

۲۵۔ الجامع الصحیح :۔ قرآن مجید کے بعد اسلام کے احکام، اسلام کی تعلیمات اور اسلام کے اخلاق کا مجموعہ صرف وہ کلماتِ طیبہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں :

علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علمِ حدیث شاہ رگ کی۔ یہ شاہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر ان کے لیے تازہ زندگی کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ آیات کا شانِ نزول اور ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح و تعیین، اجمال کی تفصیل، عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین، یہ علمِ حدیث کے ذریعے معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح حاملِ قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیاتِ طیبہ اور اخلاق و عاداتِ مبارکہ اور آپ کے اقوال و اعمال اور آپ کے سنن و مستحبات اور احکام و ارشادات اسی علمِ حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اعمال و اقوال اور اجتہادات و استنباطات کا خزانہ بھی اسی کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کی بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے موجود و قائم ہے۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ تاقیامت رہے گا۔

---

[1] سیرۃ البخاری ص ۱۷۲

[2] ؍؍ ص ۱۷۳

مسلمانوں نے آغازِ اسلام سے قرآن پاک کے بعد اس علم کو اپنے سینے سے لگایا۔ اور اپنی پوری محنت، قابلیت اور اخلاص و عقیدت کے ساتھ اس کی ایسی خدمت کی کہ دُنیا کی کوئی قوم اپنی قدیم روایات و اسناد کی حفاظت کی مثال پیش نہیں کر سکتی اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ کیونکہ اسلام قیامت تک کی زندگی کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اس کے صحیفۂ آسمانی اور حیاتِ نبوی کا رشتہ بھی قیامت کے دامن سے وابستہ ہے[۱]۔

تدوینِ حدیث | علمِ حدیث حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) کے زمانے سے پہلے صحابہ و تابعین کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اگر آپ اس کی طرف توجہ نہ کرتے تو علمِ حدیث کا ذخیرہ وجود میں نہ آتا لیکن انہوں نے دیکھا کہ انقضائے زمانہ کے ساتھ علماء کا گروہ روز بروز گھٹتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ علومِ شرعیہ کے مٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لیے انہوں نے قاضی ابوبکر بن حزم (م ۱۲۰ھ) کو جو اس وقت مدینہ کے گورنر تھے، لکھا:

انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه فاني خفت دروس العلم وذهاب العلماء ولايقبل الا حديث النبي صلى الله عليه وسلم[۲]

احادیثِ نبویہ کی تلاش کر کے اِن کو لکھ لیں، کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے دُنیا سے اُٹھ جانے کا خدشہ ہے اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قبول کی جائے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ حکم صرف مدینہ اور گورنرِ مدینہ کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ انہوں نے تمام صوبوں کے گورنروں کے نام اسی قسم کا فرمان بھیجا تھا[۳]۔ بہرحال اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ حافظ ابن عبدالبر القرطبی الاندلسی (م ۴۶۳ھ)

---

[۱] تدوینِ حدیث مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶ء) [۲] صحیح بخاری کتاب العلم باب کیف یقبض العلم۔
[۳] فتح الباری جلد ۱ ص ۱۷۴

نے سعد بن ابراہیم کی ... [illegible] نقل کی ہے:

امرنا عمر بن عبد العزیز بجمع السنن فکتبناها دفترًا دفترًا فبعث الی کل ارض له علیها سلطان دفترًا[1]

ہم کو عمر بن عبد العزیز نے جمع حدیث کا حکم دیا۔ اور ہم نے دفتر کی دفتر حدیثیں لکھیں اور انہوں نے ایک ایک مجموعہ ہر جگہ جہاں جہاں ان کی حکومت تھی، بھیجا۔

دوسری صدی ہجری میں حدیث کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا۔ امام مالک (م ۱۷۹ھ) نے مؤطا میں اہلِ حجاز کی حدیثیں جمع کیں۔ امام ابن جریج (م ۱۵۰ھ)، مکہ معظمہ میں، امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ)، شام میں امام سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) نے کوفہ میں اور ابوسلمہ حماد (م ۱۶۷ھ) نے اہل بصرہ کی احادیث کے مجموعے مرتب کیے[2] تیسری صدی ہجری میں امام بخاری نے احادیث کی جمع پر توجہ کی۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ فریضہ کس طرح انجام دیا۔

صحیح بخاری کا اصلی نام صحیح بخاری کا اصل نام یہ ہے۔ الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ و سننہ و ایامہ، حقیقت یہ ہے کہ ایک حدیث کے مجموعے کے لیے اس سے زیادہ مناسب اور جامع نام ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

تصنیف کا آغاز متعین طور پر تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ امام صاحب نے بخاری کی تالیف کا آغاز کس سنہ میں کیا اور کب اس سے فارغ ہوئے، لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس کی تالیف و تکمیل کے بعد انہوں نے اسے اپنے شیوخ امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) امام علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ) اور امام یحیٰی بن معین (م ۲۳۳ھ) کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۳۳ھ میں یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی، البتہ اس میں بعد میں اضافے ہوتے رہے۔

[1] جامع البیان العلم ص ۳۸

[2] مقدمہ فتح الباری ص ۴، ۵

نواب صدیق حسن خان قنوجی والی بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:۔

ابن عدی با جماعتی از شیوخ خود نقل کردہ کہ بخاری تحویل تراجم کتاب خویش در مدینہ درمیان قبر و منبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بتقدیم رسانیدہ و ہر ترجمہ کہ می نوشت دو رکعت نماز می گذارد و وجہ توفیق بیان نقل مکہ (مسجد حرام) و مدینہ این گفتہ اند کہ مسودہ در مسجد الحرام کردہ باشد در مدینہ مطہرہ آں را بیاض بردہ[1]

یعنی اصل مسودہ پر نظر ثانی مسجد الحرام میں ہوئی۔ اور وہاں تنقیح و تہذیب کے بعد دوسرا مسودہ تیار فرمایا۔ پھر مسجد نبوی میں مسودہ ثانیہ میں ترجمۃ الابواب مقرر فرمایا۔ اس مبیضہ میں احادیث درج فرماتے وقت یہاں بھی ہر حدیث پر دو رکعت نماز ادا فرمانے کا التزام و اہتمام رکھا۔ بلاشبہ اس تصنیفی محنت اور تہذیب و تنقیح کے سلسلہ میں ان کو دو تین بار از سر نو مسودہ جات کو بدلنا اور دوسرا لکھنا پڑا۔ اور اس کو مہذب اور منقح کرانے کے سلسلہ میں عظیم مجاہدہ سے گزرنا پڑا۔

امام صاحب نے صحیح بخاری کو جس محنت اور عرق ریزی سے مرتب کیا اور صحیح احادیث اس میں جمع کیں۔ یہ صرف امام بخاری ہی کا کام تھا۔ حافظ ابن الصلاح (م ۶۴۳ھ) نے اپنے مقدمہ میں اور مولانا عبدالحی لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) ظفر الامانی میں امام صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما ادخلت فی کتابی الجامع إلا ما صح وتركت من الصحاح لحال الطول[2]

میں نے کتاب جامع الصحیح میں صرف صحیح حدیثوں کو داخل کیا ہے۔

---

[1] اتحاف النبلاء ص ۵۰

[2] مقدمہ ابن الصلاح ص ۸، ظفر الامانی ص ۵۷

اور آگے فرماتے ہیں:

خرجت کتاب الصحیح من زھاء ستمائۃ الف حدیث

وجعلتہ حجۃ بینی وبین اللہ تعالیٰ [1]

یعنی میں نے اپنی جامع صحیح کو ۶ لاکھ طرق سے صحیح احادیث کو منتخب کرکے تیار کیا ہے اور اپنے اور اللہ عزوجل کے درمیان اس کو حجت قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے امام صاحب کا قول اس طرح نقل کیا ہے۔

قال صنفت کتاب الجامع فی المسجد الحرام وما ادخلت فیہ حدیثاً

حتی استخرت اللہ وصلیت رکعتین وتیقنت صحتہ [2]

اور محی السنۃ نواب صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے فرمایا:

داخل نکردم در صحیح ہیچ حدیث مگر بعد استخارہ ثبوت صحت وے [3]

یعنی امام بخاری نے جامع صحیح بخاری کے مسودہ پر مسجد حرام میں نظر ثانی فرمائی اور ہر حدیث کو جامع صحیح میں لکھتے وقت تازہ غسل کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور ہر حدیث پر استخارہ کیا۔ اور جب بیقین صحت حاصل ہوا تو اس حدیث کو جامع صحیح میں شامل کیا۔

(باقی)

---

[1] ظفر الامانی ص ۳۱ و مقدمہ فتح الباری ص ۴

[2] مقدمہ فتح الباری

[3] اتحاف النبلاء ص ۴۸

بحث ونظر

بیعتِ عقبہ ثانیہ اور حضرت عباسؓ

جناب طالب ہاشمی صاحب

ترجمان القرآن کے شمارہ اگست ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر محمد سلیمان صاحب کا ایک مقالہ عنوانِ بالا پر شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ (جو فی الحقیقت بیعتِ عقبہ ثالثہ ہے اور جسے بیعتِ عقبہ کبیرہ اور لیلۃ العقبہ بھی کہا جاتا ہے) کے موقع پر حضرت عباسؓ کی موجودگی والی مشہور روایت موضوع ہے۔ فاضل مقالہ نگار اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں شعبۂ علومِ اسلامیہ کے اُستاد ہیں، لیکن اس مقالے میں انہوں نے تحقیق کا جو انداز پیش کیا ہے وہ نرالا بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ بالفاظِ دیگر یہ مقالہ ان کے بلند منصب کے تقاضوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اُنہوں نے اپنے استدلال کی بنیاد قیاس آرائی کے پائے چوبیں پر رکھی ہے۔ حالانکہ کسی روایت کو ردّ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو جرح وتعدیل کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور جن واسطوں سے یہ روایت ہم تک پہنچی ہے، ان میں سے کسی واسطے کو نا قابلِ اعتماد ثابت کیا جائے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب نے محض قیاسات اور مفروضات کا سہارا لیا ہے۔ اگر وہ روایات کی چھان پھٹک کا معروف طریقہ اختیار کرتے جو اہلِ علم میں مقبول ومتداول ہے تو اُن کی باتوں میں یقیناً وزن محسوس کیا جاتا۔ اب اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ جس سطح پر ڈاکٹر صاحب نے دادِ تحقیق دی ہے، اسی سطح پر اس کا جواب دیا جائے۔

جہاں تک اس بیعت کے موقع پر حضرت عباسؓ کی موجودگی کا تعلق ہے تو قدیم اور جدید

تمام سیرت نگاروں نے اس کو تسلیم کیا ہے اور قریب قریب تمام اربابِ سیَر و تاریخ نے یہ واقعہ تواتر کے ساتھ بیان کیا ہے (ابن اسحاقؒ، ابن ہشامؒ، واقدیؒ، طبریؒ، ابن سعدؒ، احمد بن حنبلؒ، بیہقیؒ، شعبیؒ، طبرانیؒ، حاکمؒ، بزارؒ، ابن قیمؒ، ابن خلدونؒ، ابن کثیرؒ وغیرہم سب اس پر متفق ہیں)۔ ان سب کو جھٹلانے کے لیے قوی دلائل کی ضرورت ہے جو ڈاکٹر صاحب کے مقالے میں مفقود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے موقف کی تائید میں کم از کم ایک ہی روایت پیش کر دیتے تو پھر بھی کوئی بات تھی۔

اب رہی حضرت عباسؓ کی تقریر ___ تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی آڑ لے کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عباسؓ سرے سے وہاں موجود ہی نہیں تھے ___ انھوں نے حضرت عباسؓ کے اِن الفاظ کو خلافِ حقیقت ٹھیرایا ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز و محترم ہیں اور ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے ہیں"۔ اور ان الفاظ کو خلافِ مصلحت کہ "اب وہ تمھارے پاس جانا چاہتے ہیں"۔

اب ہم ڈاکٹر صاحب کے اس موقف کے دونوں حصوں کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے بڑی دلیل ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف کے پہلے حصے کے حق میں یہ دی ہے کہ حضورؐ کو مجبور ہو کر طائف جانا پڑا تھا۔ کیونکہ قریش نے آپؐ کو مکہ سے نکال دیا تھا۔ اسی لیے حضرت زیدؓ بن حارثہ نے واپسی کے سفر میں آپؐ سے کہا تھا کہ "آپؐ مکہ میں کیسے داخل ہوں گے جب کہ قریش آپؐ کو نکال چکے ہیں"۔ دوسرے یہ کہ آپؐ مطعم بن عدی کی پناہ حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ باتیں اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ "حضورؐ اپنے خاندان میں معزز و محترم نہیں تھے اور بنو ہاشم ہمیشہ آپؐ کے سینہ سپر نہیں رہے تھے ___ یا یہ کہ اُن کی حمایت سے دست کش ہو چکے تھے"۔

مناسب ہوتا کہ اس سلسلے میں فاضل مقالہ نگار مندرجہ ذیل حقائق کو بھی پیش نظر رکھتے:

۱- موسیٰ بن عقبہ اور ابنِ اسحاق سرے سے اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ سفرِ طائف میں آپؐ کے ساتھ تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ آپؐ تنہا طائف تشریف لے گئے تھے۔

۲۔ ابن سعدؒ، ابن قتیبہؒ اور بلاذریؒ کے بیان کے مطابق حضورؐ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ساتھ لے کر طائف تشریف لے گئے تھے۔ (گویا حضرت زیدؓ کے حضورؐ کے ساتھ جانے میں اختلاف ہے)۔

۳۔ حدیث، تاریخ اور سیرت کا تمام ذخیرہ کھنگال ڈالیے آپ کو ایک روایت بھی ایسی نہیں ملے گی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ مشرکینِ قریش نے حضورؐ کو بجبر مکہ سے نکال دیا تھا یا آپؐ ہجرت کے ارادے سے طائف تشریف لے گئے تھے۔ یہاں ان بہت سی روایتوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اہلِ حق کا مکہ سے نکلنا (ہجرت کرنا) مشرکین کی مصلحتوں کے خلاف تھا۔ کیوں؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔ ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ کے وقت مشرکین نے جس طرح مسلمانوں کی مزاحمت کی اس کو اہلِ سیر نے تواتر کے ساتھ بیان کیا ہے گویا مشرکین مسلمانوں کو مکہ سے نکلنے سے روکتے تھے نہ کہ ان کو زبردستی نکالتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے جو تدبیریں کیں وہ تاریخ کا ایک ناقابلِ تردید حصہ ہیں۔

۴۔ واپسی کے سفر میں حضرت زیدؓ بن حارثہ سے جو بات منسوب کی گئی ہے وہ صرف واقدی کا بیان ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حضورؐ اور حضرت زیدؓ کے سوا کوئی تیسرا شخص اس موقع پر موجود نہیں تھا تو پھر قطعی طور پر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت زیدؓ نے یہ بات حضورؐ سے کہی جب کہ کوئی مستند حدیث بھی اس کی تائید میں موجود نہیں۔ کیا یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ راوی نے کسی غلط فہمی یا اپنے قیاس کی بنا پر یہ الفاظ حضرت زیدؓ سے منسوب کر دیئے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعی حضرت زیدؓ نے یہ بات حضورؐ کی خدمت میں عرض کی تو کیا اصطلاحی طور پر اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ "قریشِ مکہ آپؐ کی دعوت کو رد کر چکے ہیں، وہ آپؐ کی دشمنی میں بہت جری ہو گئے ہیں اور اب جب کہ اہلِ طائف نے بھی آپؐ کی دعوت قبول نہیں کی تو مکہ میں آپؐ دعوتِ حق کو کیسے جاری رکھ سکیں گے"۔

۵۔ یہ بات (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے) کسی روایت میں نہیں ہے کہ:

"آپؐ نے معززینِ طائف سے کہا تھا کہ اہلِ مکہ کو میرے اس مشن کے

بارے میں نہ بتانا ......"

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ نے صرف عمرو بن عمیر ثقفی کے بیٹوں مسعود، حبیب اور عبد یالیل سے اتنی بات کہی تھی کہ "میری بات کو مخفی رکھو" (یعنی جو باتیں میرے اور تمہارے درمیان ہوئی ہیں ان کو پردۂ اخفا میں رکھو) یہ بات آپؐ نے اس لیے فرمائی کہ آپ طائف پہنچ کر سب سے پہلے ان تینوں سے ملے اور ابھی آپؐ کو طائف کے دوسرے صاحب اثر لوگوں سے ملنا تھا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ یہ تینوں "تخلیہ کی اس گفتگو" کو اپنے تک ہی رکھیں تاکہ دوسرے لوگوں تک بھی آپؐ اپنا پیغام پہنچا سکیں (اور ان تینوں کے منفی ردعمل کا دوسروں پر اثر نہ پڑے)۔ ان لوگوں سے اتنی سی شرافت برتنے کی توقع آپؐ کو شاید اس لیے بھی تھی کہ حضورؐ کی والدہ کے خاندان "بنو زہرہ" سے بنو ثقیف کے خاندان "بنو عبد یالیل" کے ساتھ رشتہ داری تھی اور بنو عبد یالیل کو حضورؐ کے ماموؤں کا خاندان کہا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان لوگوں نے عرب کی روایتی مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپؐ سے غیر شریفانہ برتاؤ کیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ چاہتے ہوں کہ اہل مکہ کو اہل طائف کے ردعمل کا فوری طور پر پتہ نہ چلے۔ لیکن یہ قیاس کرنا صحیح نہیں کہ آپؐ کے نزدیک آپ کا دورہ طائف زیادہ عرصے کے لیے اہل مکہ سے مخفی رہ سکتا تھا۔ قریش اور بنو ثقیف کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ خود آپ کی ایک بھتیجی (ابولہب کی بیٹی) طائف میں بیاہی گئی تھی۔ رؤسائے قریش کی طائف میں قیمتی جاگیریں تھیں۔ قریش کے دو رئیس عتبہ اور شیبہ حضورؐ کے دورۂ طائف کے موقع پر طائف میں موجود تھے۔ عروہ بن مسعود ثقفی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی اور کئی دوسرے ثقفی حضرات کا آئے دن مکہ میں آنا جانا رہتا تھا۔ طائف مکہ کا توام شہر تھا اور آپ کا وہاں تشریف لے جانا آپؐ کی حکمت تبلیغ کا ایک حصہ تھا۔ یہ نہیں کہ آپ وہاں ہجرت کے ارادے سے گئے ہوں یا آپ کو اہل مکہ نے بزور مکہ سے نکال دیا تھا۔

اب رہا پناہ حاصل کر کے مکہ میں داخل ہونا تو اس کا مطلب (بنو ہاشم اور بنو مطلب کے علاوہ کسی دوسرے قبیلے کی) حمایت حاصل کرنا تھا۔ ورنہ حقیقی معنوں میں حضورؐ ہمیشہ اللہ کی پناہ طلب کیا کرتے تھے۔ مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کرنے کا مطلب یہ کیسے لیا جاسکتا ہے کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب آپؐ کی حمایت سے دست کش ہو چکے تھے اور مکہ میں کوئی آپؐ کا یار و مددگار نہیں تھا۔

"دست کشی" اور "دوسروں کے مقابلے میں مادی کمزوری" میں بڑا فرق ہے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مسلمان آپؐ کی حمایت سے دست کش ہو سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مومنین بلکہ دوسرے خاندانوں (بنو تیم، بنو عدی، بنو امیہ، بنو زہرہ، بنو عبدالدار، بنو سہم، بنو جمح، بنو اسد، بنو مخزوم، بنو عامر بن لؤی، بنو فہر بن مالک وغیرہ) کے مومنین بھی آپؐ پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار تھے (اور اپنے ان جان نثاروں کو کفار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آپؐ نے مکہ سے ہجرت کر جانے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا)۔ یہ الگ بات ہے کہ عددی اور مادی قوت کے لحاظ سے مشرکینِ مکہ کا پلّہ بھاری تھا۔ کیا مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کرنے سے حضورؐ کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا تھا کہ مشرکین کے اتحاد میں رخنہ ڈالا جائے اور ان کے دندانِ ظلم کو کند کیا جائے ــــ اور یہ حمایت بھی حضورؐ کس لیے حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے کہ "میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکوں" (ابن اسحاق)۔ کیا حضورؐ نے یہ حمایت حاصل کرنے کی خاطر مطعم کی کوئی شرط مانی تھی؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی شرط پر حمایت حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جناب ابوطالب دس برس تک حضورؐ کا دفاع کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد بنو ہاشم حضورؐ کی حمایت سے یکسر دست کش ہو گئے، سوائے ان چند دنوں کے جن میں ابولہب نے آپؐ کی حمایت کی۔ کیا مناسب نہ ہوگا کہ یہاں ابن سعد اور بعض دوسرے اہلِ سِیَر کی ان روایتوں کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ جناب ابوطالب نے مرتے وقت سردارانِ قریش کو وصیت کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا اور اپنی اولاد کو بطورِ خاص وصیت کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کرنا۔ کیا جناب ابوطالب کی اولاد ایسی ہی گئی گزری تھی کہ اس نے اپنے باپ کی وصیت کو فراموش کر دیا اور حضورؐ کی حمایت سے دست کش ہو گئی۔ بالخصوص نوجوان علیؓ کے بارے میں ایسا گمان کرنا ظالمانہ جسارت ہے۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے بارے میں بھی اس قسم کی بات نہیں کہی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب ابوطالب کی زندگی میں بھی مشرکین نے حضورؐ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ

آپ کو شہید کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ لیکن جناب ابو طالب نے جوانانِ بنو ہاشم و بنو مطلب کی مدد سے آپ کی حفاظت کی۔ آخر شعب ابی طالب کی محصوری کا زہرہ گداز واقعہ بھی تو جناب ابی طالب کی زندگی ہی میں پیش آیا ـــــ ہمارے اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانے میں ابو طالب زندہ تھے اور بنو ہاشم حضورؐ کی پوری طرح حمایت کر رہے تھے۔ (بقول ڈاکٹر صاحب آپ کی حمایت سے "دست کش" نہیں ہوئے تھے۔) اس وقت بھی وہ مشرکین قریش کو آپ پر زیادتیاں کرنے سے کلیتہً نہیں روک سکے تھے۔ جناب ابو طالب کی وفات کے بعد اگر ابو لہب حضورؐ کی حمایت جاری بھی رکھتا تو کیا مشرکین اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیتے اور ان حالات میں کوئی تبدیلی آجاتی؟ ہرگز نہیں! ہمارے نزدیک تو ابو لہب کی حمایت والی روایت اس لحاظ سے مشکوک ہے کہ یہ وہی بدباطن شخص تھا جس نے حضورؐ کی بچیوں کو اپنے بیٹوں سے طلاق دلوائی، آپؐ کے صاحبزادے کی وفات پر مسرت کا اظہار کیا۔ جس کی بیوی آپؐ کے دروازے پر کانٹے بچھایا کرتی تھی، جس نے دعوتِ حق کو روکنے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں۔ اور جس کی مذمت اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نام لے کر کی۔ وہ حضورؐ کی حمایت پر کیسے آمادہ ہو سکتا تھا۔ اور آپؐ سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ آپؐ اپنا کام جاری رکھیں ـــــ قرآن کریم کی نصِ صریح کے ہوتے ہوئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کے نہاں خانۂ دل میں کبھی روشنی کی کرن پھوٹی ہو ـــــ اور پھر حمایت سے اس کی دست کشی کی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے جناب عبدالمطلب کو دوزخی کہا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جناب عبدالمطلب حضورؐ کے دادا بھی تھے اور محسن بھی۔ جب وہ فوت ہوئے تو حضورؐ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپؐ ان کے سرہانے کھڑے ہو کر رونے لگے۔ (آپؐ کا سن اس وقت آٹھ برس کا تھا) حضورؐ اپنے محسنوں کے بارے میں یہ طرزِ کلام اختیار نہیں فرماتے تھے، بلکہ ان کا ذکر بھلائی سے کیا کرتے تھے۔ مطعم بن عدی ہی کو لیجیے۔ اس کی حمایت کا احسان حضورؐ نے ہمیشہ یاد رکھا (حالانکہ وہ حالتِ کفر میں مرا تھا)۔ غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور مجھ سے ان گھناؤنے لوگوں کے متعلق بات کرتا تو میں اس کی خاطر انہیں چھوڑ دیتا۔ (صحیح بخاری، مسند احمد، مسند ابو داؤد)۔

اس قسم کی کئی اور مثالیں بھی ملتی ہیں ـــــ اور پھر جناب عبدالمطلب کے متعلق ایسی روایتیں بھی موجود ہیں کہ وہ موحد تھے - اس کا سب سے بڑا ثبوت ابرہہ کے حملے کے وقت آپ کا طرز عمل تھا - علامہ سیوطیؒ نے "مسالک الحنفاء" میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کے اجداد میں نضر، خزیمہ، الیاس، مضر، ربیعہ، معد اور عدنان سب موحد تھے اور دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے - علامہ محمود شکری بغدادی نے کتاب "بلوغ الادب فی احوال المعرب" (جلد دوم) میں کعب، قصیّ، عبد مناف، ہاشم اور جناب عبدالمطلب کو بھی زمرۂ موحدین میں داخل کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ سب دینِ ابراہیم پر کاربند تھے (یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کے دو بڑے مکاتبِ فکر حضورؐ کے اجداد کو موحد مانتے ہیں - اور اپنے موقف کے حق میں دلائل بھی رکھتے ہیں - لیکن یہ ایک الگ بحث ہے) -

کیا اس سلسلے کی تمام روایتوں کو سامنے رکھ کر اس بات کی گنجائش نہیں کہ جناب عبدالمطلب کو حنفاء میں شمار کیا جائے ؟ اور حنفاء کے بارے میں حضورؐ کا مسلک یہ تھا کہ جب آپؐ سے مشہور حنفی زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں اُن کے صاحبزادے حضرت سعیدؓ بن زید نے پوچھا کہ میرے والد اسلام سے پہلے فوت ہوئے کیا ہم اُن کے لیے دعائے مغفرت کر سکتے ہیں - تو حضورؐ نے فرمایا "ہاں ـــ زید تنہا ایک اُمت کی حیثیت سے اُٹھائے جائیں گے" -

کیا خوب ہوتا اگر ڈاکٹر صاحب اس روایت کی چھان پھٹک کرتے - اور اس کی سندی حیثیت کا جائزہ لیتے ـــــ اس کے بجائے انہوں نے اسے اپنی تائید میں پیش کر دیا - اگر اس روایت کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ابولہب اور اس کے زیرِ اثر چند غیر مسلم ہاشمی حضورؐ کی حمایت سے دست کش ہو گئے - یہ نہیں کہ باقی سارے بنو ہاشم بالخصوص ہاشمی مسلمانوں نے بھی حضورؐ کی حمایت ترک کر دی - یہ کہنا بالکل خلافِ حقیقت اور محض ایک مفروضہ ہے کہ ابولہب کی آپؐ کی حمایت سے دست کشی آپؐ کے سفرِ طائف کا باعث ہوئی - حضورؐ نہ سفرِ طائف سے پہلے کبھی اس کی مخالفت کو خاطر میں لاتے تھے اور نہ بعد میں کبھی اس کی پروا کی - یہی سبب تھا کہ وہ آپؐ کا جانی دشمن بن گیا تھا - ہجرت سے پہلے حضورؐ کو شہید کرنے کے لیے جو لوگ نامزد کیے گئے تھے، ان میں ایک ابولہب

بھی تھا۔ یہ بھی محض ایک مفروضہ ہے کہ تمام بنو ہاشم نے اس کو اپنا سربراہ اور سردار تسلیم کر لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ "واقعہ طائف کے بعد سفر ہجرت تک ہمیں کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ مطعم بن عدی نے اپنی دی ہوئی امان کو واپس لے لیا ہو اور آنحضرتؐ کو دوبارہ کسی ہاشمی یا کسی اور مکی سردار کے پاس پناہ کی تلاش میں جانا پڑا ہو"۔

ہم ڈاکٹر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی شہادت بھی ملتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ سفرِ طائف کے بعد مکہ کے اشرار نے حضورؐ کو ستانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے برعکس ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ مکی دور کے آخری تین سالوں میں جب حضورؐ مختلف قبائل کے پاس دعوتِ توحید دینے تشریف لے جاتے تو ابوجہل، ابولہب اور دوسرے اشرار آپؐ کے پیچھے لگے رہتے۔ قبائل کو آپؐ کے خلاف بھڑکاتے اور آپؐ پر خاک اور پتھر پھینکتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے دارالندوہ میں جمع ہو کر آپؐ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسی مجلس میں جب کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے بزور نکال دیا جائے، تو اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ شخص یہاں سے نکل گیا تو عرب کے مختلف قبیلوں کو اپنی جادوبیانی سے اپنا حامی بنا لے گا۔ ان شہادتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مطعم بن عدی کی پناہ اور حمایت عملاً ختم ہو چکی تھی۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر ان تمام شہادتوں پر کیوں نہ پڑی۔

اگر حضرت عباسؓ نے یہ کہا کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان میں معزز و محترم ہیں اور ہم نے ہمیشہ ان کی حفاظت کی ہے"، تو غلط نہیں کہا، خود جناب ابوطالب نے آپؐ کے معزز و محترم ہونے کا اعتراف اپنی وصیت میں کیا تھا۔ اور بقول ابن سعد اپنی اولاد سے کہا تھا کہ تم ہمیشہ بخیر رہو گے جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سنتے رہو گے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے رہو گے اور بقول قسطلانی اور زرقانی سردارانِ قریش سے کہا تھا۔

"......محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قریش میں امین اور تمام عرب میں صادق ترین آدمی ہے اور وہ ان تمام خوبیوں کا جامع ہے جو میں نے تم سے بیان کی ہیں......"

ابوطالب کی وفات کے بعد کیا حضورؐ کے کردار میں نعوذ باللہ کوئی تبدیلی آگئی تھی کہ آپؐ بنو ہاشم (اور بنو مطلب) کے نزدیک معزز و محترم نہیں رہے تھے اور وہ آپ کی حمایت سے

دست کش ہو گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین قریش آپؐ کے خون کے پیاسے تھے۔ اُن کا بس چلتا تو وہ آپؐ کو شہید [illegible] کے دوسرے جان نثاروں کی حمایت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہوئے اور آپؐ کی جان سلامت رہی۔

اب ہم ڈاکٹر صاحب کے موقف کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عباسؓ کا اپنی تقریر میں یہ کہنا کہ " اب وہ (حضورؐ) تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں"۔ خلافِ مصلحت تھا۔ ہماری سمجھ میں بات نہیں آتی کہ حضرت عباسؓ کا یہ کہنا خلاف مصلحت کیسے ہوگیا، جب کہ تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ مکی دور کے آخری تین سالوں میں جب حضورؐ مختلف قبائل کے پاس تبلیغِ حق کے لیے تشریف لے جاتے تو کھلے الفاظ میں ان سے فرماتے :

" قریش نے مجھے اللہ کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے تم تبلیغِ حق کے کام میں میری مدد کرو۔ مجھے اپنے ہاں پناہ دو (مجھے اپنے علاقے میں لے چلو) اور میری حمایت کرو تاکہ میں اپنے رب کے پیغام کی اشاعت کروں"۔

یہی بات آپؐ اوس وخزرج (اہل مدینہ) کے سامنے بھی ارشاد فرما چکے تھے۔ کیا حضرت عباسؓ کوئی سودے بازی (بقول ڈاکٹر صاحب معاملات کا لین دین) کر رہے تھے جو نبوی مصلحتوں سے ہٹ کر کوئی بات نہ کرتے ! فی الحقیقت حضرت عباسؓ کی یہ تقریر سراسر حضورؐ کی خیر خواہی پر مبنی تھی۔ وہ اپنے طور پر انصار سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ وہ کسی وقت مدینہ میں مشکلات سے گھبرا کر حضورؐ کو تنہا نہیں چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ آپ کی حمایت کا مطلب یہ تھا کہ سارا عرب ان (اہلِ مدینہ) کا مخالف ہو جاتے اور ان کو بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑے، اس وقت حضورؐ کو تنہا چھوڑ دینے سے بہتر تھا کہ وہ آپؐ کو مکہ ہی میں رہنے دیں۔ یہاں بہر حال آپؐ کے ایسے جان نثار موجود ہیں جو آپؐ کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے۔

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں گزشتہ اڑھائی سال سے اسلام حیرت انگیز تیزی سے پھیلا تھا۔ اور چند گھروں کے سوا سب اوس وخزرج مسلمان ہو چکے تھے۔ اب مدینہ کو مرکزِ اسلام

بنانے کے لیے میدان ہموار ہو چکا تھا۔ مکہ آنے سے پہلے انصارِ مدینہ یہ طے کر کے چلے تھے کہ حضورؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دیں۔ (مسندِ احمد، طبری، طبرانی وغیرہ) ۔ انصار کو مکہ میں آنحضرتؐ اور آپؐ کے جان نثاروں کی مشکلات کا بخوبی علم تھا۔ اور کوئی بات ان سے مخفی نہ تھی (مسنداحمد، طبرانی اور کئی دوسری کتابوں میں یہ تفصیل موجود ہے)۔ حضرت عباسؓ اپنی کسی بات سے انصار کو مغالطے میں نہیں ڈال سکتے تھے اور نہ ان کا یہ مقصد تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ انہوں نے "انصار کے مقابلے میں حضورؐ کی پوزیشن کو کمزور کر دیا" انتہائی مضحکہ خیز اور طفلانہ بات ہے۔ علامہ ابن خلدونؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ انصار نے حضورؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دینے سے پہلے مشرکینِ مکہ کے پاس ایک وفد بھیجا تھا، جس کے ہاتھ بنو مُرّہ بن مالک کے مشہور شاعر ابوقیس بن الصلت سے ایک طویل قصیدہ لکھوا کر روانہ کیا تھا اور ساتھ ہی ایک خط بھی بھیجا تھا۔ اس خط اور قصیدے میں قریش سے کہا گیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز و احترام ملحوظ رکھیں اور آپؐ کو ستانا چھوڑ دیں۔ (اس قصیدے کے ۳۵ اشعار تھے اور ابن اسحاقؒ نے اس کو کتاب السیر میں حرف بحرف نقل کیا ہے) لیکن قریش نے اس وفد کی بات نہ مانی۔ مختصر یہ کہ اہلِ مدینہ مکہ کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنی تمام کارروائی کو خفیہ رکھا۔ مکہ آ کر ان کے چند آدمیوں نے حضورؐ سے تخلیہ میں ملاقات کی۔ اُس وقت آپؐ حضرت عباسؓ کے پاس تشریف فرما تھے۔ وہیں طے پایا کہ رات کے وقت عقبہ کی گھاٹی میں رازداری کے ساتھ مسلمانانِ مدینہ سے ملاقات ہو گی۔ (طبریؒ، ابن ہشامؒ، احمد بن حنبلؒ، طبرانی وغیرہ)

یہ سوال کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کو چھوڑ کر حضرت عباسؓ کو ساتھ کیوں لے گئے؟ تو اس کی مصلحت اللہ اور اُس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے تھے۔ ایسی موشگافیاں کہ حضورؐ نے یہ کیوں کیا اور وہ کیوں کیا؟ بہت ہی ناخوشگوار مباحث کو جنم دے سکتی ہیں۔ اللہ کے رسولؐ کے کسی عمل کو اپنی سوچ کے پیمانے سے ماپنا بالکل غلط طریقِ کار ہے۔ یہ کیا دلیل ہوئی کہ حضورؐ فلاں فلاں جان نثار کو ساتھ نہیں لے گئے اس لیے آپؐ کا حضرت عباسؓ کو ساتھ لے جانا بھی محلِ نظر ہے اور

یہ روایت عباسی حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے سبحان اللہ ویسے یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضورؐ حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت علیؓ کو بھی ساتھ لے گئے تھے اور ان کو عقبہ کی گھاٹی کے دونوں سروں پر کھڑا کر دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ لکھنا کہ "حضرت عباسؓ نے (یہ کہہ کر) انصار کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں پناہ دینے کے عوض ان سے من مانی شرائط منوا سکیں" ایک ایسی عبارت ہے جس کی کسی صاحبِ نظر آدمی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو "کجا می نمائی و کجا می زنی" کے مترادف ہے۔

انصار نے حضورؐ کو رسولِ برحق تسلیم کیا، آپؐ پر ایمان لائے، آپؐ کے دستِ مبارک پر مرنے جینے کی بیعت کی اور بدیں الفاظ آپؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی کہ ہم اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی حفاظت اور نصرت کریں گے۔ گویا تمام خطرات کے علی الرغم اور سارے عرب کے ردّعمل سے بے نیاز ہو کر حضورؐ کو اپنے آقا و مولا، مخدوم و مطاع اور سردار کی حیثیت سے مدینہ آنے کی دعوت دی نہ کہ پناہ گزین کی حیثیت سے۔ من مانی شرائط منوانے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ کیا انصارِ مدینہ نعوذ باللہ اتنے دنیا پرست اور گھٹیا کردار کے مالک تھے کہ وہ اپنے ہادی اور خدا کے سچے رسولؐ سے من مانی شرائط منواتے۔ ان کی تو صرف ایک تمنا تھی کہ حضورؐ ان سے کبھی جدا نہ ہوں تنگی میں بھی اور فراخی میں بھی۔ کیا حضرت عباسؓ انصار سے یہ کہتے کہ "آنحضرتؐ تمھارے پاس نہیں جانا چاہتے"۔ حالانکہ حضورؐ ان کے پاس جانا چاہتے تھے اور خود ان سے فرما چکے تھے کہ تم اللہ کا پیغام پہنچانے میں میری مدد کرو، حمایت کرو اور اپنے علاقے (شہر) میں مجھے لے چلو۔

ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ دین کے معاملے میں لین دین، سودے بازی اور منافقانہ سیاست بازی کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ ہر چیز کو مادی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا مغربی دانش وروں کا شیوہ تو ہو سکتا ہے ایک اسلامی دانش گاہ کے کسی استاد کا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔ دانش ورانِ مغرب کو کیا خبر کہ اخلاص، ایثار، عقیدت، محبت، اطاعت اور سوز دروں کی کیا قدر و قیمت ہوتی ہے، لیکن مفکر ہونے کا دعویٰ کرنے والے ایک مسلمان کو تو ان چیزوں سے بے خبر

نہیں ہونا چاہیے ۔ کیا یہ شتر گربگی نہیں ہے کہ آپ نے اپنی سوچ کے مطابق ایک خاص نظریہ قائم کر لیا اور پھر ایک سیرت نگار کی وہ روایت تو اپنی تائید میں پیش کر دی جو آپ کی سوچ کے سانچے میں پوری بیٹھتی ہے، لیکن اسی سیرت نگار کی وہ روایت موضوع قرار دے کر رد کر دی جو آپ کے خود ساختہ نظریے کے مطابق نہیں ہے ۔ یہ تحقیق نہیں بلکہ لوگوں کو فکری انتشار میں مبتلا کرنا ہے ۔ معلوم ہوا ہے کہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے بعض اساتذہ نے اسی مشن کو اپنا لیا ہے ۔ اس سے پہلے اسی یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر صاحب نے

"THE DEVELOPMENT OF MILITARY INTELLIGENCE IN THE CAREER OF THE PROPHET AT MEDINA."

کے موضوع پر مقالہ لکھ کر اپنی تحقیق انیق کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ دشمنانِ اسلام کو تو خوش کر سکتا ہے اور ایک برطانوی یونیورسٹی سے ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دلا سکتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک کوئی ایسا شخص جو اسلام کی اخلاقی اقدار پر پورا ایمان رکھتا ہو، کبھی ایسا مقالہ لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ کاش اسلامیہ یونیورسٹی کے یہ استاد اپنی صلاحیتوں کو تعمیری علمی کاموں پر صرف کرتے ۔

ترجمان القرآن کے اوراق میں ڈاکٹر محمد سلیمان کے مضمون (بیعتِ عقبہ ثانیہ اور حضرت عباسؓ) کی اشاعت پر ہمیں اس لیے بہت افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کیے ہوئے کاموں پر پہلے سے ہی گستاخیِ جنابِ رسالتمآبؐ کا الزام تھا جس کا ہمیں علم نہیں تھا ۔ شخصیت کو پہلے سے جانے بغیر ہم نے اس خیال سے ایک قابلِ بحث امر کو شائع کر دیا کہ اس کا مدلل جواب سامنے آنے سے ڈاکٹر صاحب کا فکری مقام زیادہ اچھی طرح سامنے آ جائے گا ۔ چنانچہ ہمارے معزز دوست طالب الہاشمی صاحب نے بہت کم وقت میں اپنی وسعتِ مطالعہ کی بنا پر جوابی مقالہ لکھ دیا ۔ اُمید ہے کہ اس مقالے کے ذریعے ہماری پچھلی کوتاہی کی تلافی ہو جائے گی ۔

حالات کو جاننے کے بعد ہم بھی ایسے شخص کے بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی سے برطرفی کے علاوہ یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ گستاخیِ جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مدلل الزام کے زیر اثر مقدمہ بھی چلایا جانا چاہیے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر ہاے پوتا نے آواز اٹھائی ہے ۔ (مدیر)

ایک خط

سود، مرابحہ اور مارک اَپ

نعیم صدیقی

برادرم محمد نواز صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ میں نے آپ کا مفصل سوال "سود، مرابحہ اور مارک اَپ" کے عنوان سے ترجمان القرآن میں اس خیال سے شائع کیا تھا کہ ہمارے علماء میں سے اگر کوئی بزرگ فرصت نکال کر مفصل علمی جواب لکھ دیں تو نہایت اچھا ہو گا۔ مگر تا حال کوئی چیز سامنے نہیں آئی۔ البتہ امید ہے کہ شاید اشاعتِ آئندہ میں کوئی مقالہ لایا جا سکے گا۔ مگر یہ بھی مناسب معلوم ہوا کہ آپ نے جو بحث چھیڑی ہے اس کے جواب میں خاموشی طاری رہے۔

مسائل و معاملات میں راہ صواب تلاش کرنے کے لیے اوّلین رہنمائی نصوص سے لینی چاہیے کیونکہ نصوص یا تو راستہ کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے یا کسی راستے کے اردگرد کے سنگ ومیل کو نمایاں کر دیتی ہیں۔

قرآن ہم سے کہتا ہے کہ اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور سود میں سے جو کچھ وصول طلب رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو، اگر تم فی الواقع ایمان رکھتے ہو (البقرہ ۲۷۸)۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر خدا اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے (البقرہ ۲۷۹)۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اُٹھتے مگر صرف اس شخص کی طرح جسے اپنا اثر ڈال کر شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہو (البقرہ ۲۷۵)۔ اور ایک حدیث یہ بتاتی ہے کہ سود کا گناہ ایسا بھاری

ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کی عصمت پر بستر بار حملہ آور ہو۔

ان نصوص سے نہ صرف سود کی حرمت ظاہر ہوتی ہے، بلکہ اس کا شدید اور بدترین ہونا بھی واضح ہوتا ہے۔ تمام گناہوں کا معاملہ بالکل یکساں نہیں ہے، بلکہ بعض کبیرہ گناہ بعض کبیرہ گناہوں سے زیادہ بھاری ہوتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال سود کی ہے جو پوری معیشت کو ناپاک کر دیتا ہے، نفس پرستی کو پھیلاتا ہے، انسانی ہمدردی کو ختم کرتا ہے اور اخلاق عامہ میں پستی پیدا کرتا ہے۔

اس حقیقت کو اگر سامنے رکھا جائے تو ہر اس معاملے سے بچنا چاہیے جس میں سود کی جھلک اور سود کی مشابہت پائی جائے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث ایسے بیوع اور لین دین کے معاملات کو ممنوع ٹھہراتی ہیں جن میں ذرا سا بھی شائبہ اصول ربوا کا پایا جائے۔ پھر یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ سود کی نئی نئی تعریفیں کرنے اور سود کو لیپا پوتی سے طرح طرح کی شکلیں دے کر جائز بنانے کے اجتہادات سے بھی بچا جائے۔ ایسے غلط خطوط پر دی ہوئی علمی آرا یا اخباری بحثیں اور سیمناروں کے مقالے بھی قیامت کے دن اس لیے وبال بن سکتے ہیں کہ غلط طریقوں کے رواج پا جانے سے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں فساد داخل ہوتا ہے۔

ضرورت تھی کہ غیر سودی بنکنگ کے ان ناقص اور حیلہ سازانہ طریقوں پر تفصیلی بحث کی جائے۔ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے مباحث سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے، بلکہ عرب ممالک میں ڈاکٹر سمیع کے مقالے اور ان پر جوابی یا تائیدی بحثوں کا جائزہ بھی لینا چاہیے اور یہاں کے بعض پروگریسو مذہبی دانش وروں کے خیالات سے بھی تعرض کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ حضرات سرمایہ داروں اور بنک کاروں کے کاروبار کی گاڑیوں کے لیے بطور سفر مینا فکری سڑکوں کی تیاری کا کام بھی کر رہے ہیں اور اسلام سے عملاً آزاد اور تجدد پسند اجتہادیوں کو ضروری مواد بھی فراہم کر کے دے رہے ہیں۔

ان بحثوں کا محرک یہ غلط تصور ہے کہ موجودہ بنکنگ سسٹم کی مشینری کو جوں کا توں رکھ کر صرف ایک پرزے کو بدلنے سے کام چل جائے گا اور وہ ہے سود۔ پورے سسٹم کا مزاج ہی دوسرا ہے، اسے کسی ایک پرزے کی تبدیلی سے نہیں بدلا جا سکتا۔ مگر سپیئر پارٹس کے کچھ فکری اسٹور ایسے ہیں جن کا اس عجیب فارمولے پر ایمان ہے کہ کسی ٹینک کو ایک آدھ پرزے کی تبدیلی سے ٹریکٹر میں بدلا جا سکتا ہے، یا کوئی مشین گن ایک پرزے کے ادل بدل سے سلائی مشین کی شکل اختیار کر سکتی

ہے۔ اس طلسماتی مشغلے کے لیے فقروں سے فقرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جا رہے ہیں اور ان میں نئے مفہوم پیدا کیے جا رہے ہیں، کچھ استثنائی جزوی مثالوں کو اخذ کر کے انہیں کاروباری نظام میں مستقل روح بنایا جا رہا ہے، بعض حیلے ایجاد کیے گئے ہیں اور حیلے کے اصول کو بھی اس کے استثنائی مرتبے سے ہٹا کر مستقل نظام کی شکل دی جا رہی ہے۔ حالانکہ کرنے کا کام یہ ہے کہ بنکنگ کے پورے سسٹم کو نئی بنیادوں پر استوار کیا جائے، مثلاً نظام شراکت پر۔ بالفاظ مولینا مودودیؒ "جو روپیہ اب قرض کے طور پر لگایا جاتا ہے وہ آئندہ سے شرکت کے اصول پر لگایا جائے۔" (معاشیاتِ اسلام ص ۶۲)

اس وقت میں ایک چیز پر گرفت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تصور کہ ایک ہی چیز کی نقد قیمت اور نسیئہ قیمت الگ الگ ہو سکتی ہے، قرآن و حدیث کے نصوص سے متصادم ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے یوں سوال کیا گیا تھا:

"اگر کوئی دکاندار اس اصول پر عمل پیرا ہو کہ وہ نقد خریدنے والے گاہک سے اشیا کی کم قیمت لے اور ادھار لینے والے سے زیادہ تو کیا وہ سود خوری کا مرتکب ہوگا؟ ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ فروخت پر کچھ معمولی سا کمیشن رکھا جاتا ہے، مثلاً ایک پیسہ فی روپیہ ---------- اور یہ صرف نقد خریداری کی صورت میں گاہک کو ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟"

جواب ملاحظہ ہو:

"پہلی صورت تو صریحاً سود کی ہے۔ رہی دوسری شکل تو اگرچہ اصطلاحاً یہ سود کی تعریف میں نہیں آتی، لیکن اس کے اندر روح تو سود ہی کی موجود ہے۔ فقہ کی زبان میں یہ ربوا نہیں ہے مگر ریبہ ضرور ہے اور ریبہ بھی پرہیز کے لائق ہے (دعوا الربوا والریبۃ (الحدیث)) (حوالہ رسائل و مسائل۔ جلد ا ص ۲۹۷ - ۲۹۶)

جدید بنکنگ کے طریقہ ہائے حیلہ گری میں سے ایک اہم صورت یہی نقد و نسیہ کے لیے جنس کی دو قیمتوں کی گنجائش ہے۔

ذرا تصور فرمائیے کہ ایک دکان یا دفتر میں ایک سود خور بنیا بیٹھا ہے اور وہ آٹے کے ایک گاہک

سے یہ کہنا ہے کہ آٹے کی یہ بوری چاہو تو ایک صد روپیہ نقد دے کر لے لو اور چاہو تو تین ماہ بعد مجھے ایک سو پچیس روپے دینا۔ گاہک کہتا ہے کہ یہ تو سود ہے۔ تب بنیا اُسے بتاتا ہے کہ برابر ہی غیر سودی کاروبار کرنے والی ایک مسلم فرم یا اسلامی بنک کا دفتر ہے، ان سے معاملہ کر لو۔ وہاں وہ جاتا ہے اور وہاں اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ تم ایک سو روپے لے جاؤ اور ہمارے لیے اُس بنیے سے آٹے کی بوری خرید لاؤ، پھر وہ بوری اس شرط پر ہم تمہارے ہاتھ بیچ دیں گے کہ تین ماہ بعد تم ہمیں ایک سو پچیس روپے دے دینا۔ ذرا یہاں کفر کیش، سود خوار بنیے اور سود سے پرہیز کرنے والی مسلم فرم یا بنک کے درمیان فرق و امتیاز واضح کر کے دکھایئے۔ از روئے حقیقت کیا فرق ہوا۔ بس یہی ہیر پھیر آج کل کی بنک کاری کا ایک اہم دروازۂ کاروبار ہے۔

اسی طرح بنک سے اُدھار لیے ہوئے مال یا اشتراک کی صورت میں ۲ یا ۳ % ماہانہ شرح یا ۴۶ پیسے فی ہزار روپے فی یوم پہلے سے طے کر لینا کہ دوسرے فریق کو چاہے نفع ہو یا نقصان بنک کو ہر حال میں کم سے کم مقررہ نفع ضرور ملے گا۔ یہ طرزِ معاملہ اصولِ اشتراک پر پورا نہیں اُترتا بلکہ سود کی تعریف میں آتا ہے۔ بنک سوائے سرمایہ لگانے کے نہ کوئی کام کرتا ہے اور نہ کسی طرح کا "رسک" (اندیشۂ نقصان) اس کے حصے میں آتا ہے، لہٰذا ایسا معاملہ جائز غیر سودی معاملہ نہیں ہو سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نقد و نسیہ قیمتیں مقرر کرنے میں صاحبِ مال مختار ہے، مگر شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے اس کا اختیار محدود ہے۔ اللہ کے سپریم منصوص قانون سے۔ کسی بھی طرح کا سودی معاملہ کرنا اور سودی معاملہ کے مشابہ کوئی صورت اختیار کرنا اس کے لیے ممنوع ہے۔ چاہے ہزار قسم کے عقلی جواز اور مفاد اس کے سامنے رکھ دیے جائیں۔

اسلامی بنکنگ کا آغاز کرتے ہوئے ہمارا ذہن یہ ہونا چاہیے کہ ہم مغربی تہذیب اور مغربی معیشت سے برسرِ جنگ ہیں، اور اپنا راستہ ان کی تقلید کر کے نہیں بلکہ اجتہاد کر کے نکالیں گے۔ ہم نظامِ باطل کی کسی چیز کو محض لیپا پوتی کر کے اور اسلامیت کی مہر لگا کر اختیار نہیں کریں گے اور نہ حیلہ بازیاں کریں گے۔ نظام کی تبدیلی حیلہ بازیوں اور جواز کی راہیں (باقی صفحہ ۴۰)

رسائل و مسائل

موت فوت کی رسوم

مولانا عبدالمالک صاحب - منصورہ - لاہور

سوال :- گزارش ہے کہ ہماری برادری مندرجہ ذیل مسائل پر معلومات چاہتی ہے مہربانی کر کے قرآن و حدیث کے مطابق جواب ارسال فرمائیں - نوازش ہوگی -

۱ — برادری میں اگر کوئی فرد انتقال کر جائے - مقامی شہر کے اور دوسرے شہروں کے رشتہ دار اس کے جنازے میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں بعد دفن کے تین دن سوگوار کے گھر گزارتے ہیں - کیا سوگوار کے گھر تین دن رہنا جائز ہے ؟

۲ — اس دوران شہر کے رشتہ دار اپنے اپنے گھروں سے کھانا لا کر سوگوار اور مہمان کو کھلاتے ہیں اور آپ خود بھی ساتھ کھاتے ہیں - یہ خدمت دو تین دن تک جاری رہتی ہے - کیا لوگوں کا کھانا مرحوم کے گھر کھانا جائز ہے ؟

۳ — ساڑھے بارہ کلو گرام بھنے ہوئے چنے کے ایک ایک دانے پر کلمہ پڑھا جاتا ہے اور پورا قرآن شریف ختم کیا جاتا ہے تیسرے دن سوا لاکھ کلمہ اور پورا قرآن شریف مرحوم کو بخشا جاتا ہے - کیا اس عمل سے مرحوم کو ثواب ملے گا ؟

۴ — اس کے بعد ایک وقت کا کھانا نزدیکی رشتہ دار اجتماعی طور پر پکاتے ہیں خرچ برابر برابر تقسیم کر کے ادا کرتے ہیں اور کھاتے ہیں سوگوار اور مہمانوں کے علاوہ شہر کے رشتہ داروں کو بھی شریک کرتے ہیں - اگر اتفاق سے کوئی رشتہ دار سے حصہ نہ مانگے تو سخت ناراض ہوتے ہیں - اور حصہ دینا اپنا حق سمجھتے ہیں - یہ

کھانا عام طور پر گوشت روٹی ہوتا ہے۔ لیکن کئی اصحاب اِس کھانے کو ناجائز کہتے ہیں اور کھانے سے انکار کرتے ہیں۔ کیا اجتماعی کھانا ناجائز ہے؟

۵ــ سوگوار کے گھر کا پانی تو استعمال کر لیتے ہیں، مگر چائے، پان اور سگریٹ وغیرہ استعمال نہیں کرتے خواہ بازار سے لا کر دیں۔ یہ پابندی مرحوم کے انتقال کے وقت سے ۷۲ گھنٹے تک جاری رہتی ہے۔ کیا سوگوار کے گھر کا پانی استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب: جواب درج ذیل ہے:۔

۱ــ مسلمان بھائی کے جنازے میں شرکت کرنا اسلامی اخوت کا تقاضا ہے مسلمان بھائی کا حق ہے۔ جنازے میں شرکت کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن جنازے میں شرکت اور تعزیت کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے جانا چاہیے۔ میت کے گھر میں ٹھہرے رہنا اور جمع رہنا مناسب نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رد المحتار میں فرماتے ہیں۔

"وفی الامداد وقال کثیر من متاخری ائمتنا یکرہ الاجتماع عند صاحب البیت ویکرہ الجلوس فی بیتہ حتی یاتی الیہ من یعزی بل اذا فرغ ورجع الناس من الدفن فلیتفرقوا ویشتغل الناس بامورھم وصاحب البیت بامرہ" (جلد ۲ ص ۲۴۱)

(صاحب خانہ کے پاس اجتماع مکروہ ہے اور اس کا گھر میں بیٹھ جانا کہ لوگ اس کے پاس تعزیت کے لیے آئیں، مکروہ ہے بلکہ جب وہ فارغ ہو جائے اور لوگ میت کو دفن کر کے واپس آ جائیں تو منتشر ہو جانا چاہیے۔ لوگ اپنے کام کریں اور صاحبِ خانہ اپنا کام۔)

اس لیے میّت کو دفنا دینے کے بعد میت کے گھر میں ٹھہرنے کو ایک رسم بنا لینا درست نہیں ہے۔ بلکہ اپنی اور گھر والوں کی سہولت کو مدنظر رکھ کر کسی رسم کے بغیر ٹھہرنے یا چلے جانے کا پروگرام

بنانا چاہیے۔[1]

۲۔ میت کے گھر والوں کو ایک دن رات کا کھانا کھلانے کا انتظام پڑوسیوں اور دُور کے قرابت داروں کو کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ردّ المحتار میں ہے۔

"ویستحب لجیران اہل البیت والاقرباء الاباعد تہیئۃ طعام یشبعہم یومہم ولیلتہم" (ج ۲ ص ۲۴۰)

(وہ قرابت دار جو دوسرے شہروں سے چل کر آئے ہوں، ان کے کھانے کا انتظام بھی اس میں شامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اُن کے لیے دُور دراز سے سفر کر کے آنے کے بعد فوری طور پر واپس جانا ممکن نہیں ہوتا۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل خانہ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے ایک دن رات کے کھانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ بعد میں گھر والے خود اپنا انتظام کریں۔

۳۔ میت کے قرابت دار اور دوست بلا اُجرت قرآن پاک یا کوئی اور چیز پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچائیں تو فقہاء احناف اور دیگر متعدد فقہاء کے نزدیک میت کو ثواب پہنچتا ہے (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ اُس کو ثواب پہنچا دے کہ وہ اس کا اہل ہو۔) اس لیے کہ ایک تو اُجرت دے کر پڑھانے پر ثواب نہیں پہنچتا اور غیر ضروری قیود لگا کر پڑھنے کو معمول بنانا جیسے کہ چنوں پر پڑھنے کا معمول ہے، درست نہیں ہے۔ جبکہ ہر طرح سے ثواب پہنچ سکتا ہے تو پھر اپنی طرف سے پابندیاں لگانا کیا معنی رکھتا ہے۔

---

[1] کسی گھر سے تعلق رکھنے والے ماں باپ، چچا تایا، ماموں بیٹے بیٹیاں، داماد بہوئیں وغیرہ تو گویا اسی گھر کے افراد ہوتے ہیں وہ جب تک ضرورت ہو رُک سکتے ہیں، خاص طور پر اہل خانہ کی خواہش پر ان کی بعض ضروریات کے لیے، مثلاً بعض رُکے ہوئے کاموں کی انجام دہی کے لیے، کسی بیمار کے علاج معالجے کے انتظام و تیمارداری کے لیے، اگر چند روز کھانا پکانے اور انتظامات کرنے کی ضرورت ہو تو بہن بھائی، بھتیجے بھانجے، چچا، تایا، پھوپھی وغیرہ رشتہ دار اسی طرح کے موقعوں پر کام آسکتے ہیں۔ (ن-م)

۴ ـــ میت والوں کے گھر میں اجتماعی کھانے کا پروگرام بنانا بھی ایک رسم ہے جس کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ شریعت میں صرف ایک دن رات کے کھانے کا انتظام کرنے اور وہ بھی اہل خانہ اور اس کے مہمان رشتہ داروں کے لیے، کی ہدایت ہے۔

۵ ـــ سوگوار کے گھر کا پانی چائے وغیرہ قبول نہ کرنا اور اسے رسم بنانا درست نہیں ہے۔ الغرض بلا ضرورت ٹھہر جانے کی رسم ڈالنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اور تعزیت کے لیے آنے والوں کو پانی وغیرہ کی ضرورت پیش آئے تو وہ سوگوار کے گھر سے پی سکتے ہیں، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

(بقیہ سود، مرابحہ اور مارک اپ)

تلاش کرنے سے نہیں ہو سکتی۔

اس وقت آغاز کار میں اگر اجتہاد کے نام پر تقلیدی فکر اور مرعوب مزاج معاملات میں دخیل ہو گیا تو پھر عزیمت کو تو کبھی یہاں راستہ نہ مل سکے گا۔

اس مختصر نوٹ کے ساتھ میں مرابحہ اور مارک آپ کے سسٹم کے متعلق آپ کے نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہوں، البتہ اس سسٹم کی تفصیلات اور کچھ فقہی نکات اور صحیح اسلامی بنکنگ سسٹم کے خطوطِ کار پر ایک مفصل مقالہ کی ضرورت ہے، خدا جلد وقت، قوت اور توفیق دے۔

تحریکی لٹریچر میں خوب صورت اضافہ

یادوں کی امانت

سید عمر تلمسانی

ترجمہ: حافظ محمد ادریس

مجلد مع ڈسٹ کور ـــ صفحات: ۵۱۲ قیمت ۷۰/- روپے

البدر پبلی کیشنز۔ ۲۳۔ راحت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

خدوخالِ اقبال

چند اجمالی نکات بہ طور تبصرہ از مدیر

خدوخالِ اقبال۔ از جناب محمد امین زبیری۔ ناشر: خسروی ناظم آباد، ۴/ڈی۔ ۲/۶ کراچی ۱۰۶

صفحات: ۱۷۶، قیمت: دبیز سرورق کے ساتھ ۵۵/- روپے

اقبال ایک ایسی شخصیت تھی اور اس کتاب کے مباحث اتنی اکساہٹ دلاتے ہیں کہ اگر ترجمان القرآن کے صفحات اجازت دیتے تو ایک تنقیدی مقالہ لکھ دیتا۔ اب مختصر اٹے بہ صورت چند نکات عرض کرتا ہوں:۔

۱۔ جناب مؤلف کے متعلق میرا مطالعہ یہ ہے کہ انہوں نے ادب کی مثبت خدمات سے بڑھ کر ادب نگاروں کے حق میں منفی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ (بحوالہ تکبیر کراچی) یعنی لعد ادب میری ناقص رائے یہ ہے کہ ذہنیت صحت مندیا کم سے کم متوازن نہیں۔

۲۔ اقبال ایک ایسا شاعر ہے جو تخیل کی روحِ جبریل کے ساتھ بالعموم بہت اونچے آفاقی پرواز میں رہتا ہے۔ کبھی کبھار اس کی پرواز بلند کی برقی لہر ٹوٹتی ہے تو وہ زمین پر بھی آجاتا ہے۔ ریت کے کسی تودے پر، کسی سرکنڈے کے قریب، کسی چٹان کی نوک پر، کسی جھیل کے کنارے وغیرہ۔

محمد امین زبیری صاحب نے ایسے ہی مقامات پر اتفاقاً چند لمحوں کے لیے آ نکلنے کو غور و فکر کا اصل محور سمجھ لیا۔ اور پھر یہ سوچنا شروع کیا کہ اگر کسی شخص کے کسی دور میں کمزوری کا کوئی لمحہ آجائے تو پھر اس کی ساری بلند پروازیاں، اس کے معرکے، اس کا آخری بازی تک مارے جانا بالکل بے معنی ہے۔

۳۔ محمد امین زبیری صاحب اگر اقبال یا ملت کے خیر خواہ ہوتے تو وہ اس بات کا خیال رکھتے کہ عین وہ زمانہ جب کہ پاکستان کی علامت و دلیل بننے والی ہر چیز کو عالمگیر قوتوں کے شعوری اور

غیر شعوری آلہ ہائے کار ملیا میٹ کرنے اور لایعنی بنانے کے درپے ہیں — مثلاً اردو کے قومی زبان ہونے کے خلاف جھگڑے، صوبوں اور (STATES) کے ایک ہونے اور محکم نظامِ وفاق کے خلاف جھگڑے، قراردادِ پاکستان پر بحثیں، اسلام اور قانونِ شریعت کے خلاف شور و غل اور ازاں جملہ اقبال کے خلاف طرح طرح کی نکتہ آرائیاں، کیونکہ وہ آنے والے اسلامی دور کا رجز خواں اور پاکستان کا علمبردار بنا۔ ایک گروہ نے پہلے تو اقبالؒ کو اس کے مقام سے گرانا چاہا۔ پھر یہ ثابت کرنا چاہا کہ اقبالؒ تو سوشلسٹ تھا اور ہمارا ہی نغمہ الاپ رہا تھا، ناکام ہونے کے بعد ایک بار پھر اقبال پر متفرق حملے — فن پر بھی — مذہبیت کو شاعری میں لا گھسیڑنے پر بھی، اور ذاتی زندگی کی وہ کمزوریاں بھی جس کو زبیری صاحب نے تازہ کیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج کل جب کہ نظریۂ پاکستان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی طرح اقبال پر بھی لادین، کمیونسٹ، قادیانی، انحراف پسند، تجدد کار وغیرہ سارے ہی حلقوں کے دانش ور حملہ آور ہیں۔ ابنِ زبیری کے ناشر کو اس مرحلے میں اگر اقبالؒ پر وار کرنے کی سوجھی تو کیا صرف اس لیے کہ اس کارِ خیر میں حصہ ادا ہو جائے۔

۴ — الزامات میں سے ایک اقبال کی شادیوں اور اولاد وغیرہ کا حصہ ہے۔ پوری طرح صفائی بیان کرنے کے لیے مکمل معلومات میرے پاس جمع نہیں ہیں، مگر میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں — خصوصاً وہ دور جس کی بات ہو رہی ہے — عائلی اور ازدواجی زندگی کا آغاز و انجام بڑے عجیب و غریب طریقوں سے ہوتا تھا۔ بن پوچھے اور بن جانے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو غائبانہ قبول کرتے تھے، کبھی گاڑی بخوبی چلتی تھی اور کبھی پٹڑی سے اتر جاتی۔ رہا مالی معاملہ تو اس وقت ریکارڈ پر جتنی رقوم کا آفتاب اقبال کو دینا اور دلے کر دینا ثابت ہے وہ آج کے معیار سے دیکھیں تو بہت بڑی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ثابت کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے دوسری بیوی کو کبھی مالی سہارا بہم نہ پہنچایا ہو۔

۵ — پھر ایک سوال ویگے ناسٹ اور عطیہ کا چھیڑا گیا ہے اور یہ مخالفین کے پاس بہت بڑا الزام نامہ رہا ہے۔ مگر انہوں نے چند حقائق پر غور نہیں کیا۔ کسی شخص کے دل میں جنسِ مخالف

کے کسی فرد کے متعلق محض کسی فطری خیال یا جذبے کا پیدا ہونا نہ شرعاً اور اخلاقاً جرم ہے اور اتنے اچھے اور بُرے خیالوں کے قافلوں کو لمحہ بہ لمحہ دماغ میں داخل ہونے سے کوئی بشری قوت روک سکتی ہے۔ اعتراض تب اٹھتا ہے جب اس کے اظہار اور عملی اقدام سے بُرائی ظاہر ہوتی ہو۔ اقبال جیسا صحت مند اور ذہین مشرقی نوجوان یک دم اٹھا کر اس آزمائش کی بھٹی میں ڈال دیا گیا کہ برابر کی ذہین اور ماڈرن اور بے باک خواتین گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ اب اس نوجوان کا یہ کمال دیکھیے کہ وہ کہیں اظہارِ مدعا میں دینی اخلاق یا مروجہ تہذیبی شائستگی کے لحاظ سے ایک انچ آگے یا پیچھے نہیں ہوتا۔ زیادہ تر فدائیت دوسری جانب سے ہے اور یہی چیز اقبال کی آگ کو تیز کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر حرفِ تمنا کے سیلِ ضبط کو ایک سوئی کے سرے سے روک رکھا ہے۔ آپ کوئی گرمی ہوئی سرکت کرتے ہوئے اسے نہیں دیکھتے، یہاں تک کہ ایک پرائیویٹ ڈائری کے اوراق کے علاوہ آپ اس کی پوری شاعری کی اٹھان اور اڑان میں فرق آتا نہیں دیکھتے۔ وہ اپنی شاعری کا محور کسی حالت میں بھی اپنے ناکام جذبۂ محبت اور ویگے ناسٹ اور عطیہ کے بتانِ حسن کو نہیں بناتا۔ بعد کی شاعری کو تو چھوڑیئے، بانگِ درا ہی کو پڑھیے، دوچار شوخ اشعار کے علاوہ ساری کتاب آپ کو پاکیزہ شاعری کا مجموعہ ملے گی اور اس میں احیائے اسلام کا وہ جذبہ اور ملت کے ظہورِ ثانی کا وہ ولولہ بھی آپ کو پھیلا ہوا نظر آئے گا جو آگے چل کر ان کے کلام کی روح بن گیا۔ یہ ہے اقبال کا کمال کہ عالمِ سفلی کے نظر فریب جلووں میں گھرنے کے باوجود وہ اپنی اس متاعِ پیغام کو بچا لیتا ہے جسے وہ قوم کے واسطے سے دنیائے انسانیت تک پہنچانا چاہتا ہے۔ ورنہ اگر اس کی شاعری جنسیت کے اسرار و رموز میں ڈوب جاتی اور اس کا تخیل کسی عورت کے مجسمۂ تصوری کے گرد طواف کرتا رہ جاتا تو اس کی شاعری میں کونسی غیر معمولی قدر و قیمت ہوتی۔ میں تو داد دیتا ہوں کہ اقبال نے خواہشاتی دنیا کی دیو پیکر اور جادوگر قوتوں سے جنگ لڑی اور وہ اس میں کامیاب ہو کر افق تا افق خودی کے نور کا پیغام پھیلانے والا مشعل بردار شاعر بنا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہوئی؟

۶۔ میرا ثانی نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ اگر وہ جنسی کامیابی کے گرداب میں گھر جاتا تو شاید ہم

اُس عظیم اقبال کو نہ پا سکتے جو ہمارے لیے سرمایۂ فخر ہے۔ میں کبھی کبھی یوں بھی سوچتا ہوں کہ بعض خاص شخصیتوں کو نظامِ تکوین و تقدیر ان کی زندگی کی کسی قدر پست مگر جذباتی طور پر ہیجان خیز آرزوؤں میں ناکام کر کے بھی اُن کی قوتوں کے دھارے کو بھرپور طور پر اس نصب العین کی جانب موڑ دیتا ہے جو پہلے سے بھی ان کی نگاہوں میں رچ بس تو چکا ہوتا ہے، مگر کسی دوسری رنگین آرزو کی کشش اس چاند کے لیے گہن بھی بن سکتی ہے یا کم سے کم بڑے نصب العین کی لے کا زور ضرور ٹوٹ جاتا ہے۔ دُنیوی زندگی میں اگر ناکامیٔ آرزو نہ ہوتی تو نفسانی آرزوؤں سے بلند تر کسی اعلیٰ مقصد کے لیے شاذ ہی کوئی شخص خدمت گر ہو سکتا۔ اقبال کے لیے نفسانی سطح پر ناکامیٔ آرزو کا ایک ایسا زخم ضروری تھا جو مسلسل ٹیسیں دیتا رہے اور اقبال اس قابل ہو سکے کہ ایک ٹھوس نظامِ حقیقت کو سوز و ساز کے ساتھ پیش کر کے دل نشین بنا سکے۔ چنانچہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قریبی دور کا مغربی ادب اور اس کی نقالی میں تشکیل پانے والا اردو ادب جس کا مزاج سیکولر بنا دیا گیا ہے اور جس کو مذہب کی پرچھائیں تک سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کو اقبال نے اس شان سے ٹھوس اسلامی حقائق کو اُٹھانے کے قابل بنایا اور اس غرض کے لیے پتھروں کو پگھلا پگھلا کر گلاب کی پتیوں میں تبدیل کیا کہ جن لوگوں نے اقبال کی شاعری کے اصل سرور کو پا لیا، ان کی نگاہوں میں پھر کوئی دوسرا شاعر کبھی جچ نہ سکا۔ اگرچہ متعدد حضرات کی یہ خواہش رہی کہ انھیں اقبال کے طے کردہ جادۂ فن و معانی سے آگے کا سفر کرنے والا شاعر مانا جائے یا کم از کم اس کے برابر سرا بر تو قرار دیا جائے ___ اور اس کے لیے بعض اشخاص اور اداروں نے زور بھی لگایا، مگر بات بن نہ سکی۔ آخر الامر ایسے لوگ "انگور کھٹے ہیں" کے معنوں میں یہی کہتے رہ گئے کہ اقبال بڑا رجعت پسند ہے۔

میرے سامنے ایسے کئی دوسرے شعرا ہیں جنھیں جنسی کامیابیاں یا تو یاوہ گوئی اور لغو نگاری کی طرف لے گئیں، یا ناکامیاں انھیں مایوسی اور ترکِ خدا و مذہب کے جہنم کی طرف اغوا کر کے لے گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے اقبال کو دونوں بلاؤں سے محفوظ رکھ کر ملت کے لیے حیاتِ نو کا نقیب

اور انسانیت کے لیے فلاح وسعادت کا علمبردار بنایا۔

۷ — اقبال کے مخالفین نے جو مختلف طریقہ ہائے واردات اس کے خلاف صرف اس لیے استعمال کیے ہیں کہ لوگوں کے دلوں سے اس کی وقعت ختم کر کے نئے جھنڈے گاڑے جا سکیں یوں تو وہ بہت ہیں اور ان کی بڑی تفاصیل ہیں۔ مگر ایسے چند حملوں پر تبصرہ کے طور پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا" اقبال کو قاتلوں سے بچاؤ" پمفلٹ کی صورت میں چھپا۔ اب اگر کوئی مجموعہ تیار ہو سکا تو اس میں شامل کرنے کا ارادہ ہے۔ حملوں کا سلسلہ جاری ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر سلیم صاحب ماہر نفسیات نے اقبال کا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا اور میں نے جواباً خود مؤلف کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دکھایا۔ بدقسمتی سے میں نے جو اقبال کے متعلق لکھا بہت مشکل ہے کہ وہ کتابیات یا مقالات کی کسی فہرست میں شامل ہو۔ یہ بھی ایک سزا ہے۔

۸ — جہاں تک علامہ کے مالی معاملات پر اعتراض اُٹھانے کا تعلق ہے۔ بلاشبہ ان کے خیالات کی بلندی کے سامنے ان کے حوصلوں کی پستی سامنے آتی ہے، مگر ہر صورت واقعہ کو اس کے محل اور ماحول کے ساتھ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اقبال کا آدرش یہی تھا کہ انسان کو ایک طرح کی حالتِ فقر ہی میں سادہ زندگی گزار دینی چاہیے۔ اس لیے کمانے کی عمر میں انھوں نے زور شور سے کمائی نہیں کی۔ بارہا بعض مفاد سے بے اعتنائی برتی، معاملات کو اپنی شرائط کے تابع رکھنا چاہا۔ لیکن بعد کی عمر میں جب اقبال "خستہ و بیمار و پیر" تھا۔ تو اس کے سامنے اہل وعیال اور خاندان کی ضروریات تھیں۔ خود اپنے دو عزیز بچوں کے لیے پہلے تعلیم اور پھر ازدواج کے لیے مصارف درکار تھے۔ اُدھر دَورِ بیماری کا تھا اور بیماری دولت کھاتی ہے۔ بھوپال کے قیام میں وہ قرآن کے متعلق کام کرنے کا خاکہ بناتے رہے۔ پھر وہاں بیماری کا حملہ ہوا۔ ان حالات پر زبیری مرحوم نے بلیک میلنگ کی پھبتی کسی ہے جو زیادتی ہے۔

ابن زبیری صاحب اور خسروی صاحب دونوں کو شاید اس قسم کی آزمائش کا تجربہ نہ ہو۔ جب آدمی اس میں گھِر جاتا ہے تو ایک طرف خود اس کے اپنے احساسات کام کرتے ہے

ہوتے ہیں، دوسری طرف گھر کے افراد اور خاندان کے خیر خواہ ان احساسات کا بوجھ صبح و شام بڑھاتے رہتے ہیں۔ اُدھر ایک بوڑھے آدمی کے لیے احساسات کا اتنا بھاری بوجھ اُٹھانا مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اور بیمار آدمی کے لیے بہ مشکل ہوتا ہے کہ وہ کوئی کاروبار یا محنت مزدوری شروع کر دے۔ مفکر اور شاعر آدمی کی پیچیدگی یہ ہوتی ہے کہ اس کی فکر اور شاعری اس کو اپنے دائرے سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس طرح ایک ایسی صورتِ اضطرار پیدا ہو جاتی ہے کہ آدمی مجبور ہوتا ہے کہ جدھر بھی ہاتھ پاؤں مارے جا سکتے ہوں مارے جائیں ___ اور اس امر کی ترغیب اس کے احوال کے راز داں دوست احباب صبح و شام دلاتے ہیں۔ خودی، غیرت، بے نیازی اور فقر کی تعلیم دینے والا کوئی بھی بڑے سے بڑا شخص ایسے چکر میں پڑ جانے کے بعد ایسا اقدام کر سکتا ہے، جو شرعاً حرام تو ہے نہیں مگر خود اس کی اپنی پسندیدہ اُصولی معیاریت کے مطابق نہیں ہے۔ سو یہ عملی زندگی کی وہ مجبوریاں ہیں جن کا اندازہ اہلِ تجربہ و مشاہدہ ہی کو ہو سکتا ہے اور اس قسم کی اضطراری کوتاہیاں آدمی کے فلسفیانہ، فکری یا دینی اُصولوں کی نفی نہیں کرتیں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ کاش کہ زیرِ گفتگو آدمی اور زیادہ مضبوط نکلتا۔ مگر یہ کوئی معقولیت نہیں ہے کہ اس کے پیچھے تالیاں پیٹی جائیں۔ اور اس کا تہتک کیا جائے اور اُسے مقامِ تحقیر پہ دکھایا جائے اور اس کی ساری خدمات کی نفی کر دی جائے۔ ارے بھائی تنقید کر رہے ہو، ترازو ہاتھ میں لو، اس کی خوبیوں اور خدمات کو ایک پلڑے میں ڈالو اور کمزوریوں کو دوسرے میں اور پھر ٹھیک ٹھیک وزن کر کے صاف بتاؤ کہ کونسا پلڑا جھکتا ہے۔ ورنہ اگر عظیم شخصیتوں کے کارناموں کو ان کی ایک ایک کمزوری اور اضطرار کی وجہ سے کالعدم قرار دیا جائے تو پھر سوائے زبیری صاحب کی فکر اور ان کے ادب کے ہمارے پاس کیا رہے گا۔ اور وہ بھی صد ہا نگاہِ تعریض سے کیسے بچے گا۔

بلیک میلنگ کا الزام البتہ غلط ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ بعض کام اقبال کو کرنا مطلوب تھے اور اُن کا وہ شوق رکھتے تھے، اس کا ذکر بھی انھوں نے دوسروں سے کیا۔ مگر ایسے کتنے ہی عزائم ہم سب کے ناسازگاری حالات کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں یا شروع کیے ہوئے کام ناتمام رہتے ہیں۔ انسان کو انسان سمجھ کر بحث کیجیے، کمپیوٹر سمجھ کر نہیں، اور نہ فرشتہ گردان کر۔

۹ — ممتاز شخصیتوں کا جائزہ لینے والوں کو یہ ضرور غور کرنا چاہیے کہ جہاں ان کو سربلند کرنے والی خوبیاں کام کر رہی تھیں، وہاں ان کو نیچے گرانے والی کمزوریاں بھی ان میں تھیں۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ ایک شخصیت کی کمزوریاں اس کو نیچے نہ لا سکیں اور اس کی خوبیاں اُس کو بلندی پر لے اُڑیں اور آج ۱۹۰۸ء سے ۱۹۸۶ء تک برابر کہکشاؤں پہ پرواز کر رہی ہیں۔ پھر آخر ان کمزوریوں کو محدب شیشوں سے بڑا کر کے دیکھنے کا کیا فائدہ۔ ابن زبیری اقبال نہیں بن سکتے تھے اور اقبال کسی اور شاعر کی سطح پہ نہیں آ سکتا تھا۔ تجزیہ کرنا تھا کہ اقبال بعض کمزوریوں کے باوجود بڑا آدمی کیوں بنا ہے، کیا محض پروپیگنڈے کے زور سے؟

میرا خیال ہے کہ زبیری صاحب کے جانشین کے طور پر خسروی صاحب خوبیوں والے پہلو پر زیادہ غور کریں۔ اور از سرِ نو جانچ کریں اور ایک بار پھر اقبال کی قیمت مقرر کریں۔

۱۰ — اقبال ایک غلامی زدہ معاشرے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیمی مرحلہ عیسائی مشنری درس گاہ میں طے کیا۔ پھر وہ انگریزی زبان، فلسفے، معاشیات اور قانون کے جدید علوم کے حوالے ہو گیا۔ پھر وہ ڈاکٹریٹ کرنے مغرب کی کھلی سوسائٹی میں جا پہنچا۔ اور ان مراحل سے گزر کر اگر اس نے مغرب کی ترقیات کے مقابلے میں دنیائے اسلام کی گراوٹ کو بہ شدت محسوس کر کے ——— تقلیدِ مغرب کے بجائے ——— احیائے اسلام کی دعوت کا عَلم بلند کیا تو کوئی بُرا کام نہیں کیا۔

ہاں البتہ ایسے مفکر و شاعر کو آپ کسی مدرسے کے مفتی یا کسی جامع کے خطیب کے معیار سے ناپیں تولیں گے تو مایوس ہوں گے۔

اقبال نے یہ شعر کہا تھا کہ ؎

نشستم با نکویانِ فرنگی
ازاں بے نور تر روزے ندیدم

پہلا شخص ہے جو مغرب کی مصیبتوں میں تپ کر نکلتا ہے اور مغرب کی بدراہی کے اسرار و رموز کو اس تفصیل و تجزیہ سے بیان کرتا ہے جس کی کوئی مثال کسی فقیہہ، خطیب اور مفتی کے ہاں نہیں ملتی۔

زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ وہ اسلامی معیار پر پورا نہ اُترتا تھا لہٰذا اُسے غیر اسلامی باتیں کہنی چاہئیں تھیں، اُسے اسلام کے خلاف شاعری کرنی چاہیے تھی، اُسے احیائے اُمت کے تصور کو فروغ نہیں دینا چاہیے تھا۔ کیا یہی منشا تھا زبیری مرحوم کا یا یہی منشا ہے زبیری کے ناشر کا۔

جو لوگ غلامی میں رہے ہوں اور جو مغربی تعلیم و تہذیب کی وادیوں سے ہو کے آئے ہوں انھیں اسلام کی خدمت کا کوئی حق نہیں، چاہے وہ ذاتی طور پر کتنا ہی مطالعۂ اسلام کریں، بلکہ اُن کا فطری فریضہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کی حاصل کردہ تربیت کے مطابق بات کریں اس سے بغاوت نہ کریں۔

۱۱۔ پاکستان بننے سے پہلے کے دَور میں سیکولرازم کے خلاف یا تو علمائے دین اپنے خاص طرز سے کام کر رہے تھے (جو جدید طبقوں کے ہاں معتوب بھی ہو رہے تھے) اور یا پھر اقبال اُٹھا جو مغرب زدگان کی نگاہ میں وقعت رکھتے ہوئے مغربی فلسفہ و تہذیب کے اسلامی اصول و اقدار کا نقیب بنا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس شخص کے کلام نے ایک طرف عوام اور خصوصاً نوجوانوں کے لیے اور دوسری طرف اربابِ ادب و شعر کے لیے فکر و احساس کے ایسے راستے بنا دیے کہ وہ پاکستان بننے سے پہلے پہلے سیکولرازم کے طوفان کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہاں حکومتِ الٰہیہ (جاوید نامہ) کو نافذ کریں اور پھر ساری دُنیا کو اسلام کے آفاقی پیغام سے آگاہ کریں۔

ہم اپنی حالیہ تاریخ میں سے اقبال کی خدمات کے دَور کو اگر اُڑا دیں تو وہ پوری زنجیر دفعتاً ٹوٹ جاتی ہے کہ جو ہمارے مستقبل کو ہمارے ماضی سے ملاتی ہے۔ آخر اقبال کے دَور کو بے وقعت بنا دینے یا نیست و نابود کر دینے سے کیا مفید نتیجہ نکلے گا۔

۱۲۔ مجھے زبیری کی اس کتاب کے ان مندرجات سے اتفاق ہے جن میں اقبال کو فوق الانسانی رتبہ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی شان میں ایسی پُرتخیل عبارات لکھی گئی ہیں کہ جن کی رَو میں پڑ کر آدمی خود اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے اور علامہ اقبال کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا ہیں اور کہاں جا پہنچے۔

یہ بہت تکلیف دہ صورت ہے ۔ مگر اس کی ایک نفسیاتی وجہ ہے ۔ اقبال نے تو یہ چاہا تھا (جیسا کہ ان کے پیغام میں نہایت واضح ہے) کہ لوگ خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوں ۔ مگر بعض لوگوں نے یہ راستہ نکالا کہ اپنے اور خدا و رسولؐ کے درمیان اقبالؒ کو حائل کر لیا ۔ ساری محبتیں اور عقیدتیں اب اس شخصیت پر نچھاور کر دی جاتی ہیں ۔ مقصد یہ کہ اقبال کے اشعار کا مفہوم تو یہ لوگ حسبِ منشا متعین کر سکتے ہیں ، مگر خدا و رسول کے نصوص کے شکنجے میں اگر کس گئے تو پھر بڑی مشکل ہو گی ۔ گویا اقبال کو سیکولرسٹوں اور آزاد منش لوگوں نے سہارا بنا لیا ہے ۔

۱۳ ۔ علامہ اقبال کے اِس رجحان کو بھی میں تسلیم کرتا ہوں کہ انہیں کسی شخص یا حکومت کی صورت میں ذرا بھی یہ اُمید ہو جاتی کہ اس کے ذریعے اسلام کا ابھار ہو سکتا ہے یا اس سے ملّی قوت نمایاں ہوتی ہے تو اس کے دل میں بڑی کشش پیدا ہو جاتی ۔ مثلاً دَورِ اشتراکیت کے ابتدائی دَورِ ابہام میں علامہ نے کسی سے پوچھا کہ اسٹالین کے متعلق سُنا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس کا نام محمد اسٹالین ہے ۔ اسی طرح اگر شاہ افغانستان کو وہ تعلیمی نظام کی تیاری کرتے دیکھتا ہے یا تاجدارِ دکن کے دائرۂ اقتدار میں کچھ تھوڑی سی اسلامی روایات اُسے نظر آتی ہیں تو کچھ دیر کے لیے جھوم جاتا ہے ۔ سچ یہ ہے کہ اس معاملے میں اقبال ایک بچے کی طرح ہے کہ جس کو گھر کا پتہ نہ مل رہا ہو اور وہ جس کسی دروازے کو دیکھے اس کی طرف لپک جاتے مگر اس رجحان کے باوجود اصولی طور پر اسلام کی حقیقت کو اس نے مسخ کیے بغیر پیش کیا ۔

۱۴ ۔ یہ چند متفرق گذارشات قلم برداشتہ لکھی ہیں ۔ خدوخال کی ایک ایک عبارت پر بحث نہیں کی جا سکی ۔ یہ کام دوسرے لوگ کرتے رہیں گے ۔

مطبوعات

طرابلس سے حجاز تک | جناب مولانا محمد یوسف قریشی - ناشر: مؤتمر المولفین، جامعہ اشرفیہ پشاور

قیمت: ۱۰/- روپے۔

یہ ایک سفرنامہ ہے جو قدرے پرانا ہو جانے کی وجہ سے زیادہ پُرلطف ہو گیا ہے۔ اس کی تاریخِ اشاعت جون ۸۵ء ہے۔ مولانا اعتکاف بیٹھنے گئے تھے اور جا پہنچے طرابلس و حجاز تک۔

ع ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

رمضان المبارک ۸۲ء گزرا تو جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ لیبیا کی طرف سے پاکستانی علما کے ایک وفد کو طرابلس میں ہونے والی کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس میں مولانا محمد یوسف قریشی کا نام گرامی بھی شامل تھا۔ پھر این او سی اور کرنسی وغیرہ کے مسائل کا چکر شروع ہو گیا۔ ۱۳ اگست ۸۲ء کو اس سفر کا آغاز ہو گیا۔ طرابلس میں جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کی طرف سے استقبال کیا گیا، وفد کو فندق باب البحر میں ٹھہرایا گیا۔ ۱۴ اگست کو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ استاد احمد الشریف، سری لنکا کے وزیر، ماریشیس کے وزیر اور رابطہ عالمِ اسلامی کے نمائندہ کی تقریریں ہوئی۔ بعد کے اجلاس میں بہت سی اہم تقاریر ہوئیں۔ بعد میں قرار دادیں پاس ہوئیں۔ مختلف حضرات کے دیے ہوئے عشائیوں کا بیان ہے۔

یہاں سے حج و عمرہ کا راستہ نکلنے کی صورت جس طرح پیدا ہوئی اس کا تفصیلی بیان محمد یوسف قریشی صاحب نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ۱۵ اگست کو زائرینِ حرمین روانہ ہوئے اور شام کو جدہ ایئرپورٹ پر اترے۔

دلچسپ تفصیلات کا مطالعہ کرنے کے لیے اصل کتاب طلب کیجیے۔

سندھ کے حالات کی سچی تصویر از جناب محمد موسیٰ بھٹو - ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر ۲۵۸ - حیدرآباد - قیمت: -/۱۵ روپے

محمد موسیٰ بھٹو نے یہ کتاب لکھ کر بڑی قابلیت کا ثبوت دیا ہے - آج جو نیا سندھ ابھر کر ہمارے سامنے ہے اس کی تشکیل میں ہندوؤں نے کیا اثرات ڈالے - سیاسی نشاۃ ثانیہ (بمبئی سے علیحدگی کے دور) میں قومیت کی رَو، نئی تحریکوں اور نئے فتنوں کے اثرات، سندھ کی سابق مسلم سیاست کے خدوخال، پاکستان سندھ اور "سندھ صبت" کا ظہور، پھر بھٹو صاحب کے خوفناک دور، لسانی ہنگاموں کے ظہور، نواب مظفر پارٹی کے منفی کردار، اور ۱۹۸۶ء کے حالات کی تفصیل، ان کڑیوں کو جوڑنے سے آج کے مسئلہ سندھ کو سمجھا جا سکتا ہے -

مسئلہ سندھ اور دوسرے تمام تخریبی مسائل نتیجہ ہیں، ملک کو کوئی نظریہ وِژن نہ دے سکنے اور شہریوں کو اس کے مطابق تعمیرِ نَو میں مصروف نہ کر سکنے کا - یہ کوتاہی جیسے پہلے تھی، آج بھی جاری ہے - اس کے ہوتے ہوئے اہلِ اقتدار سوائے لیپا پوتی کے کچھ نہیں کر سکتے -

باقی کام دینی تبلیغ یا ادبی نگارشات کے دائرے کا رہ جاتا ہے - ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم اب آخری مرحلے میں یہ دونوں کام زور شور سے ہوں، ورنہ دشمن قوتوں نے ہمارے لیے ایک خوفناک دھماکے کی پھر تیاریاں کر لی ہیں۔

شعورِ حیات از جناب محمد یوسف اصلاحی - ناشر: شفیق الاسلام فاروقی، اسٹاکسٹ، البدر پبلیکیشنز - ۲۳ - راحت مارکیٹ، اردو بازار - لاہور ۲

جناب محمد یوسف اصلاحی دینِ برحق کے سچے علمبردار اور اس کے تقاضوں کو پیش کرنے کے لیے بہترین ادیبانہ قلم رکھتے ہیں - اسی کتاب میں انہوں نے ہمہ وقت درپیش مختلف موضوعات پہ آیات اور احادیث کی روشنی کی مدد سے نہایت اہم نکات کو نمایاں کیا ہے - مضامین مختصر بھی ہیں، آسان بھی اور بہت سبق آموز بھی - بہت سی باتیں سماجی اور نفسیاتی اصلاح کا ذریعہ ہیں - اور ان چیزوں کی بڑی شدید ضرورت ہے، بلکہ خود دین نے بڑی خاص توجہ انسانی نفسیات کی اصلاح ہی پر صرف کی ہے - امید ہے کہ اس آسان کتاب کی قدر کی جائے گی -

---

کتب نما | سیرت سوسائٹی اسلام آباد۔ (پتہ اور قیمت میں کیا لکھوں؟ کہیں درج نہیں!)

قطب نما تو آپ جانتے ہی ہیں، اس کی سوئی شمال کا رُخ بتاتی ہے۔ یہ کتب نما ہے جس کی سوئی زندگی کی سمتِ سفر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

دراصل بات تو چلی "اسلام آباد بک فیئر ۸۵ء" سے جس کا قصہ خالد رحمٰن سناتے ہیں۔

"ہزاروں کی تعداد میں لوگ آئے، لاکھوں کی تعداد میں کتب فروخت ہوئیں۔ بہترین لٹریچر کا تعارف ہوا۔"

پھر اسلام آباد کے چند شاداب دل دوستوں نے بک فیئر (اعکاظ کتب) کی کامیابی کی مسرتوں میں ادبیات کا ایک مجموعہ (مجلّہ) شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور وہ فیصلہ جب جامۂ عمل پہن چکا تو نہایت دیدہ زیب خوبصورت سفید کاغذ پہ ۱۵۰ صفحات کی ایک "کتاب الادب" چھپ کر رنگین ٹائیٹل کے ساتھ مارکیٹ میں آگئی۔

تلاش مضمون کی ہو یا انشائیہ کی، شوق سنجیدہ تحریر کا ہو یا مزاحیہ کا، دل طلب گار ہو افسانے یا شاعری کا ــــ ڈھونڈنے والے کو سب کچھ ملے گا۔

ناموں کے لحاظ سے دیکھیں تو ڈاکٹر وحید قریشی، نسیم حجازی، پروفیسر خورشید احمد، ابن الحسن سید اور شان الحق حقی، تحسین فراقی، انور مسعود، عطا حسین کلیم کے ساتھ سرد سہارنپوری، سلمیٰ یاسمین نجمی، آبادشاہ پوری، پروفیسر محمود احمد غازی، محمد الیاس فاروقی، محمد طاہر منصوری، محمد اظہار الحق اور شفق ہاشمی اور بیدل جونپوری کی شخصیتیں شریک محفل نظر آئیں۔ حتیٰ کہ اس محفل نے مجھے بھی نہیں بخشا۔

افغانستان کے متعلق اہم نظمیں شریک ہیں۔

شیشے کا گھر | از جناب محمد عبدالحکیم شرف قادری۔ ناشر: مرکزی مجلسِ رضا، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۰۶ لاہور۔ قیمت:

پہلے تو میں نام سے یہ سمجھا کہ بچوں کے لیے کہانیاں ہوں گی، مگر پڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا

کہ بزرگوں کے مقدس جھگڑے ہیں۔

مولینا احمد رضا خاں کے حلقے کے حضرات کا حملہ ہے اہلِ حدیث گروہ کے خلاف۔ اُدھر سے بھی شاید ایسا ہی ہوتا ہو۔ مگر وقت اور کاغذ اور سیاہی کا آج یہ کوئی قیمتی مصرف نہیں کہ ایک کلامی گروہ اور دوسرے کلامی گروہ یا ایک فقہی دھڑے اور دوسرے فقہی دھڑے کے درمیان وقتاً فوقتاً گولہ باری ہوتی رہے۔ کبھی شیشے کے گھروں سے اور کبھی لوہے کے گھروں سے۔ تم نے یہ لفظ کیوں لکھ دیئے؟ تم نے بات سے بات کیوں نکالی؟ تم نے حدیث کے ہوتے ہوئے یہ تصور کیسے اخذ کر لیا؟ اور تم نے عقل کے ہوتے ہوئے حدیث کو یوں سمجھا کیسے؟ علی ہذا القیاس۔ کام کرنے والوں کے ہاں غلطیاں بھی ہوتی ہیں، اختلافات بھی ہوتے ہیں مگر وہ کام کرتے ہیں۔ اور آج کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ خدا فراموش، مادہ پرست اور ظالم قوتوں کی ساحری کا شکار ہونے والے کروڑوں کمزور انسانوں کو اسلام کے شہرِ حیات کے گلی کوچوں اور محلوں، عمارتوں کی سیر اس طرح کرائیں کہ وہ امن کے اس گھر کو اپنا مسکن بنالیں۔ موجودہ سیاست کے بگاڑ کو، موجودہ معیشت کے فساد کو، آج کی ثقافت کی جنس آلودگی کو، وقت کی تہذیب کے دولت پرستانہ مزاج کو، فلسفے اور سائنس کے ٹیڑھ کو جو انکارِ خدا سے پیدا ہوا۔ حنفی، دیوبندی، اہلِ حدیث اور بریلوی سب اپنی اپنی جگہ عنوانات بحث بنائیں اور اسلامی حقیقتوں اور صداقتوں سے تعصبات اور مغالطوں کے بند قفلوں کو کھولیں، یہاں تک کہ ایک نئی دُنیا سب کی نگاہوں میں جھلکنے لگے۔

اس مسابقت میں بریلوی حضرات آگے بڑھ جائیں تو مبارک، اہلِ حدیث بھائی دوسروں سے تیز رو نکلیں تو مبارک اور دیوبندی قدم آگے بڑھا سکیں تو سب مبارک۔ سب ہمارے ہیں اور سب اگر صحیح فریضہ ادا کرنے میں منہمک ہو جائیں تو اتحاد بھی پیدا ہو جائے اور پچھلی غلطیوں کو بھول بھلایا بھی جا سکے۔

شیشے کے گھر میں تحریکِ مجاہدین کا جو خاکہ اڑایا گیا ہے، وہی اس کتاب کا اصل مرکزی ماحصل بھی ہے۔ اس کے خلاف بھی قیاسات اور حوالے دونوں ملتے ہیں۔ اور اس وقت کے عوام بھی اتنے اندھے نہ تھے کہ وہ "جہاد آزادی" کے امکانی مراحل کو نہ جانتے ہوں۔ ورنہ اتنی وابستگی اور اتنا ایثار کہاں سے آتا۔ غیر پیروی کرنے والا اپنے دائرے میں محصور رہے۔

وہ جوابی تحقیق پیش نہیں کر سکتا۔

مؤلف قابلِ داد ہیں کہ بات بات پر حوالے جمع کر کے اس چھوٹی سی کتاب کو خاصا تحقیقی رنگ دے دیا ہے۔

کاروانِ عزیمت (۱) مؤلفہ پروفیسر عبدالغنی فاروق ۔ ناشر ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ، لاہور۔ مضبوط جلد، خوبصورت ٹائیٹل، کاغذ طباعت خوب، صفحات: ۴۹۶، قیمت: ۵۰ روپے

مناسب قیمت میں تحریک اسلامی کی خدمت کر کے رخصت ہو جانے والے دس معیاری کارکنوں کا مفصل تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قاضی حمید اللہ، مولینا محمد علی مظفری، تاج الملوک، محمد باقر خاں، چوہدری محمد اکبر، مولینا عبدالعزیز، محترمہ حمیدہ بیگم، چوہدری نذیر احمد، پروفیسر عبدالحمید صدیقی اور مولینا معین الدین خٹک کی علمی و عملی خدمات پیش کرنے کے لیے پروفیسر فاروق صاحب نے مواد جمع کرنے کے لیے بڑی محنت کی۔ لوگوں سے ملاقاتیں کیں، مسودات اور خطوط حاصل کیے، انٹرویو لیے، رسائل و اخبارات کے فائل کھنگالے، سفر کیے اور پھر حاصل کردہ چیزوں کو بخوبی مرتب کیا۔ ان شخصیتوں کے حالات کا مطالعہ کرنے والے آدمی کو ایمان، اخلاق، دعوتِ حق اور حصولِ علمِ دین کے لیے تقویت ملتی ہے۔ اب ایسے لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں۔

مؤلف اگر قدرے اختصار سے کام لیتے اور بعض بیانات کو تطویل و تکرار سے بچا کے صرف ٹھوس حقائق کو نمایاں کرتے تو ۵۰۰ صفحے کی کتاب میں ہم ۳۰، ۴۰ احباب رفتگان کے احوال کا مطالعہ کر سکتے۔ اُمید ہے کہ وہ اگلے ایڈیشن میں اس کو ملحوظ رکھیں گے۔

ان کے جذبۂ کار اور لگن کی دل سے ہم قدر کرتے ہیں۔ انہوں نے خوبصورت ادبی زبان میں کتاب لکھ کر بڑا کام کیا ہے۔ اُمید ہے کہ نوجوان صفوں کے لیے یہ ذریعۂ تربیت و رہنمائی ہوگی۔

رموزِ شاعری از عزیز جبران انصاری ایم اے ۔ ناشر: عادل ناصر عادل صاحب حضری ۲۷۴ نصر قانونی قدیم سکھر۔

آج کل کے اکثر شعرا علم عروض سے بے خبر اور اوزان و قوافی سے بے نیاز ہوتے ہیں

یہ ناواقفیت بھی اس کا سبب بنی کہ پہلے نظم آزاد اور پھر نثری نظم میں نئے اصحاب کو سہولت محسوس ہوئی - پھر رجحانات سے ناواقفیت اور طریقِ تقطیع اور نظامِ قوافی سے بے تعلقی اس کا سبب بنتی ہے کہ کثرت سے اغلاط صادر ہوتی ہیں اور ہر غلطی کو جدّت یا جدیدیت کی نقاب اوڑھا دی جاتی ہے - عروض و اوزان کے متعلق پہلے بھی کتابیں موجود ہیں، مگر عزیز جبران انصاری کی تازہ کتاب رموزِ شاعری وقت کے ساتھ بڑی حد تک ہم آہنگ ہے اور انہوں نے ضروری باتیں بڑی خوبی سے ذہن نشین کرائی ہیں - شعری صنعتوں کا تذکرہ بڑا اہم ہے -

ہمارے شاعر دوست کم سے کم اس کتاب کو ضرور پڑھ لیں -

سندھ کی صورت حال | از ڈاکٹر اسرار احمد - ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر ۲۵۸ - حیدرآباد -

جناب محمد موسیٰ بھٹو کی اسی موضوع پر ایک کتاب کا تعارف ہم پہلے لکھ چکے ہیں - ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ تقریر بھی انہیں تشویشناک حالات کی عکاس ہے جو سندھ میں پائے جاتے ہیں - ڈاکٹر صاحب کا اپنا اندازِ بیان ہے - اس کا مطالعہ ملکی حالات کو سمجھنے میں مدد دے گا - اور یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ نے کمیونسٹوں کی سرپرستی میں سرزمینِ سندھ میں بارودی سرنگیں بچھادی ہیں -

مجھے یاد ہے کہ زیرِ سطح سندھ کی انتہائی پُر خطر صورتِ حالات کے متعلق مولینا مودودیؒ نے ۶۶-۱۹۶۵ء کے حکمرانوں کو بعض افراد کے ذریعے مصدقہ تفصیلی رپورٹیں بھجوائی تھیں - مگر کچھ نہ ہوا - اُس وقت جس سرچشمہ کو ایک سوئی سے بند کیا جاسکتا تھا، اب اُسے روکنے کے لیے ہاتھیوں کی قطار بھی کافی نہیں ہوگی -

خطرناک قومی مسائل سے ہماری حکومت کی بہ شانِ بے نیازی ہمیں کتنے ہی مصائب کے کولہوؤں سے گذار چکی ہے - کاش کہ اب سندھ کے معاملے کو اربابِ اقتدار نہ صرف سمجھیں

بلکہ لیپا پوتی کی سیاست ترک کرکے گہرائی میں نشتر اُتار کر آپریشن کریں، ورنہ سنہ ۷۱ء جیسے ایک اور تلخ تجربے کے لیے تیار رہیں۔

مقبوضہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟ از عبدالہادی احمد۔ ناشر: محمد رشید عباسی امیر جماعت اسلامی آزاد جموں و کشمیر، عیدگاہ روڈ، مظفر آباد۔ آزاد کشمیر۔

یہ بڑا اہم پمفلٹ ہے۔ کرۂ ارضی کے جن بہت سے خطوں میں مسلمان اعدا کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ان میں سے ایک خطہ مقبوضہ کشمیر بھی ہے جو ہماری عین سرحد پر واقع ہے۔ تاریخی حالات کے پس منظر کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کو گھٹانے اور باہر سے غیر مسلموں کو لاکر بسانے کے علاوہ کشمیر کی آزادی کی آواز اُٹھانے والوں کو لاٹھی، گولی اور قید و بند کا نشانہ بنایا جارہا ہے اور تمام ریاست پولیس سٹیٹ میں بدل چکی ہے۔ اس ظلم و تشدد کی یلغار کا سب سے بڑا نشانہ جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر ہے، کیونکہ وہ آزادی چاہنے والی عوامی اکثریت کی ترجمانی کرتی ہے۔ تعلیم گاہوں سے اُردو اور اسلامیات کی تعلیم کو ختم کرکے اور مسلمانوں کے تمام مذہبی علائم کو مٹا کر الحاد اور دہریت اور ہندو ازم کی تعلیم دی جارہی ہے۔ ہندی کو بطور خاص فروغ دیا جارہا ہے۔ ٹیلی وژن کے ذریعے عریانی و فحاشی پھیلانے کے علاوہ مسلمانوں کے دین اور ان کے دینی طور طریقوں کی سخت تضحیک کی جاتی ہے۔ اور ان کی تاریخ کو مسخ کرکے ان کے بزرگوں کو ظالم ڈاکوؤں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو ملازمتیں نہیں ملتیں اور معاشی حالات خراب ہیں۔

پمفلٹ میں ضروری معلومات خوبصورت پیرایۂ بیان سے جمع کی گئی ہیں۔

رسولِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم

از ــ اُمِّ فاروق

- کتاب جو ایمانی جذبات کو اُبھارتی ہے۔
- کتاب جو حیاتِ طیبہ کو خواتین کی نظر سے دیکھتی ہے۔
- کتاب جو حضورؐ کی شخصیت کو مختلف زاویوں سے پیش کرتی ہے۔
- کتاب جو رسولِ اکرمؐ کی دعوت، خطابت، شفقت، عدالت، معاشرت، معیشت، معمولات اور ارشادات کا تذکرہ کرتی ہے۔
- کتاب جو لاجواب، بے مثال اور مقدس جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

ضخامت	سائز	قیمت
۲۴۰ صفحات	۳۶×۲۳ / ۱۶	ڈیلکس ۳۵/- پیپر بیک ۲۵/-

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار لاہور

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

اس میں

مترجم نے قرآن حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

قسم اوّل : ۱۵۰/- روپے

قسم دوم : ۱۲۵/- روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ اردو بازار **لاہور** فون: ۳۲۴۲۶۸

نیا ایڈیشن تیار ہو کر آگیا ہے۔ آج ہی طلب فرمائیں۔